منتخب سندھی افسانے
مرتب و مترجم
سعیدہ درانی
اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد

اُردو تراجم

مرتب و مترجم

سعیدہ دُرانی

نگران اعلیٰ : غلام ربانی آگرو
مہتمم : افتخار عارف
تزئین و طباعت : طارق شاہد
سال اشاعت : ۱۹۹۴ء
تعداد : ایک ہزار
ناشر : اکادمی ادبیات پاکستان
ایچ ۸/۱، اسلام آباد
کمپوزنگ : الختار، اسلام آباد
طباعت : پرنٹ اسٹائل، اسلام آباد
قیمت : مجلد: -/۱۱۵ روپے
پیپر بیک: -/۱۰۰ روپے

ISBN : 969 - 472 - 020 - 6

فہرست

پیش نامہ

اکادمی ادبیات پاکستان کے اشاعتی منصوبے کے تحت پاکستانی زبانوں اور ان کے ادب کی ترویج و فروغ کے ضمن میں مختلف سلسلے اشاعت و طباعت اور ترتیب و تدوین کے مرحلوں سے گزر رہے ہیں۔ قومی زبان میں دیگر پاکستانی زبانوں کی ادبی تخلیقات کو منتقل کرنے کا کام اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

زیر نظر مجموعہ سندھ کے ان ممتاز تخلیق کاروں کے افسانوں پر مشتمل ہے جنہوں نے نہ صرف یہ کہ فنی اعتبار سے افسانے کو نئی سمتیں عطا کی ہیں بلکہ فکری طور پر بھی تازہ ترجہات کا اضافہ کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج سندھی افسانے کو پاکستانی زبانوں میں بہت اہم مقام حاصل ہے۔

اس انتخاب میں آپ کو نئے اور پرانے نام ایک ساتھ نظر آئیں گے۔ ہماری کوشش اور مقصود یہ ہے کہ ہم سندھی افسانے کو اس طرح پیش کرسکیں کہ اس کا تدریجی ارتقا سامنے آسکے۔ اس مجموعے کی کہانیاں معاشرتی نقطہ نظر سے لکھنے والوں کے کھلے ذہن اور واضح سماجی شعور کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ یہ افسانے موضوع کی صرف اوپری سطح تک محدود نہیں بلکہ حقائق بنی' فکری تہہ داری اور گہری رمزیت کے سبب افسانوی ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ یہ کہانیاں سندھی معاشرے کے حساس پہلوؤں کو فنکارانہ حسن کے ساتھ پیش کرتی ہیں اور سندھی افسانے کے معیار اور اعتبار کی گواہ ہیں سندھی افسانوں کا یہ پہلا مجموعہ اس یقین کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے کہ اسے صاحبان علم میں پسند کیا جائے گا امید ہے کہ ہم آئندہ بھی اس سلسلے کو برقرار رکھیں گے۔

ہماری رفیق کار محترمہ سعیدہ درانی نے سندھی افسانوں کا رواں اردو ترجمہ کیا ہے ان افسانوں میں آپ کو سندھ سانس لیتا ہوا محسوس ہو گیا جو ترجمے کی کامیابی کی دلیل ہے۔ اس مجموعے کے انتخاب و اشاعت کے مختلف مرحلوں میں ہمیں سندھ کی نامور افسانہ نگار محترمہ خیرالنساء جعفری' ڈاکٹر حیدر سندھی اور اردو کے ممتاز ادیب ڈاکٹر اعجاز راہی کی مشاورت اور معاونت حاصل رہی ہے جس کے لیے ہم ان کے شکرگزار ہیں۔

اس منصوبے پر رہنمائی کے لیے سندھی زبان کے نامور افسانہ نگار اور اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین جناب غلام ربانی آگرو کا بھی بے حد سپاس گزار ہوں جنھوں نے مختلف مراحل میں ہماری رہنمائی فرمائی اور منتخب سندھی افسانے کی اشاعت کو ممکن بنایا جاسکا۔ قائم مقام افسر مطبوعات طارق شاہد بھی نمایاں طور پر داد کے مستحق ہیں جنھوں نے اس منصوبے کو بڑی محنت اور لگن کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

افتخار عارف

اس منصوبے پر رہنمائی کے لیے سندھی زبان کے نامور افسانہ نگار اور اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین جناب غلام ربانی آگرو کا بھی بے حد سپاس گزار ہوں جنہوں نے مختلف مراحل میں ہماری رہنمائی فرمائی اور منتخب سندھی افسانے کی اشاعت کو ممکن بنایا جا سکا۔ قائم مقام افسر مطبوعات طارق شاہد بھی نمایاں طور پر داد کے مستحق ہیں جنہوں نے اس منصوبے کو بڑی محنت اور لگن کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

افتخار عارف

آغا سلیم

درد کا شہر

یہ ایک ہوٹل کی کہانی ہے۔
جس ہوٹل کی میں آپ کو کہانی سنانے والا ہوں' وہ کہیں نہیں ہے لیکن شاید ہر جگہ ہے۔ شہر کے ہر بڑے چوراہے اور ہر بڑی شاہراہ پر ہے۔ آپ کسی چوراہے سے گزریں' یا کسی بڑی شاہراہ سے گزرتے وقت گردن اٹھا کر دیکھیں گے تو آپ کو ایک عالیشان عمارت نظر آئے گی' جس کی پیشانی پر لکھا ہوگا...... ہوٹل جس میں طعام و قیام کا اعلیٰ بندوبست ہے۔ اس ہوٹل کے دروازے پر ایک فولادی بدن کا چوکیدار بیٹھا ہوا ہوگا' جس کی کمر آپ کو دیکھ کر اور بھی دوہری ہوجائے گی۔ وہ جھک کر سلام کرکے آپ کو ہوٹل کے منیجر کے پاس لے جائے گا۔ منیجر کا چہرہ خوبصورت من بھاتا اور مہمان نواز ہوگا۔ اس کے کپڑے صاف ستھرے' قیمتی اور بے داغ ہوں گے۔ آپ کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجائے گی۔ اس کی مسکراہٹ کو خوشی کی علامت نہ سمجھیے گا' کیونکہ نہ تو مسکراہٹ خوشی کا اظہار کرتی ہے' اور نہ ہی آنسو دکھوں کا۔ اگر اس کا دل غموں سے چور چور بھی ہوگا' تب بھی وہ آپ کو دیکھ کر ضرور مسکرائے گا اور بے حد نیاز مندی' خوبصورتی اور مروت سے آپ کو پوچھے گا۔ "سائیں! آپ کو کمرہ چاہیے۔" لیکن آپ کو نہ تو کمرہ چاہیے نہ بستر اور پلنگ کیونکہ آپ تو گھربار والے ہیں اور میں بے گھر ہوں۔ مجھے کمرے کی بھی ضرورت ہے' بستر اور پلنگ کی بھی۔ اس لئے میں...... ہوٹل کے ۶۶ نمبر کمرے میں رہتا ہوں اور اس کمرے میں بیٹھ کر آپ گھر بار والوں کو اس ہوٹل اور ان بے گھروں کی بستی کی کہانی سنا رہا ہوں۔

دوسرے ہوٹلوں کی طرح اس ہوٹل کی عمارت بھی بڑی اور عالیشان ہے۔ عمارت کے باہر والے حصے میں جس میں ایک لانڈری کی دوکان ہے اور ایک حجام کی۔ لانڈری والا' ہوٹل میں رہنے والوں کے گندے اور غلیظ کپڑے دھو کر اس طرح صاف کر دیتا ہے کہ ان کے پہننے سے داغدار اور غلیظ شخصیت بھی صاف ستھری ہو جاتی ہے۔ حجام اچھے خاصے مسافر کی اس طرح حجامت بناتا ہے جیسے ہم ایک دوسرے کی حجامت بناتے اور سر مونڈتے رہتے ہیں۔ ایک دوکان میں ڈاکٹر کی ڈسپنسری ہے جو ہماری روح کے کوڑھ اور ضمیر کے فالج کو ختم کرنے کی بجائے نیند کی گولیاں دیتا ہے۔ ایک دوکان میں پوسٹ آفس کی برانچ ہے جس کے دروازے پر لال رنگ کا پوسٹ بکس لٹکا ہوا ہے جو بچھڑے ہوؤں کو پریت کے پیغام پہنچاتا ہے۔ عمارت کے آخری کونے کے پاس پان والے کا کیبن (کھوکھا) ہے۔ جس میں سارا دن فلمی گانے اور اسپرو پر بھروسہ کریں--- جیسے اشتہار نشر ہوتے رہتے ہیں۔ کیبن کے پاس موچی بیٹھتا ہے جو پرانے جوتوں کو پالش کرکے ایسے چمکاتا ہے جیسے..... (کوئی تشبیہ ذہن میں نہیں آرہی ہے) موچی کے پاس ہی ہر روز تیل مالش کرنے والے لڑکے آکر بیٹھتے ہیں۔ ہوٹل کے دروازے کے پاس ایک مضبوط بدن والا سواتی پٹھان چوکیدار بیٹھتا

ہے۔ دروازے کے بالکل پاس ہی منیجر کا آفس ہے۔ ہوٹل کا منیجر اتنا نازک' نفیس اور خوبصورت ہے کہ اس کو دیکھنے سے لگتا ہے جیسے کوئی خوبصورت اور نازک بدن لڑکی مردانہ کپڑے پہن کر بیٹھی ہو۔ وہ بہت شرمیلا ہے اور ہر وقت اس کے باریک اور خوبصورت ہونٹوں پر شرمیلی مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ بات کرتے ہوئے اس طرح شرما کر نگاہیں نیچے کرتا ہے کہ اچھے بھلے صوفیوں کو معرفت کی منزل کے نشان مل جاتے ہیں' وہ ہمیشہ شرما کر حیا سے آنکھیں نیچی کئے صوفی منش مسافروں سے پیسے ادھار لیا کرتا ہے اور کبھی بھی واپس نہیں کرتا۔

منیجر کے آفس کے بعد ہوٹل کے کمرے شروع ہو جاتے ہیں۔ ہر کمرہ ایک کائنات اور ہر مسافر ایک زندہ کہانی۔ ہوٹل کے کل ۲۶ کمرے ہیں اور میرا کمرہ سب کمروں سے الگ چھٹی منزل پر ہے آس پاس کوئی دوسرا کمرہ نہیں ہے۔ سامنے بڑا سا صحن ہے' جو پانچویں منزل کی چھت ہے اور میرے کمرے کا آنگن ہے' اس میں چھوٹی سی چار دیواری بنی ہوئی ہے' میں وہاں شام کے وقت کرسی ڈال کر سگریٹ پیتا ہوں تو وہاں سے سب کچھ نظر آتا ہے۔ بلندیوں پر کھڑے ہو کر دنیا کو دیکھنے میں بھی عجیب مزہ ہے۔ بڑے بڑے قد آور اور صحت مند جوان ہوٹل کی نچلی منزلوں میں گھومتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے بونے گھوم رہے ہوں۔ کمرے کی کھڑکیاں ایسے رخ پر بنی ہیں کہ اپنی کھڑکی کا ایک طاق بھی اگر کھولتا ہوں تو ہوٹل کے ایک ایک کمرے اور ایک ایک مسافر کو دیکھ سکتا ہوں۔ دوسروں کی ذاتی زندگی میں تاک جھانک کر کے خواہ مخواہ خامیاں ڈھونڈتا ہوں کیونکہ دوسروں کی خامیاں دیکھ کر اپنی خامیوں کا جواز مل جاتا ہے اور اپنی اخلاقی برتری کا عجیب راحت بخش احساس ہوتا ہے۔ اس لئے سارا دن دوسرے مسافروں کے کمروں میں تاک جھانک کرتا ہوں' باہر کی دنیا میں ہزاروں نقاب پہن کر گھومنے والے انسان جب اپنے کمروں میں تنہا ہوتے ہیں اور..... اور اپنا سامنا کرتے ہیں' اپنا ایک ایک نقاب اتار کر کھونٹی میں لٹکا دیتے ہیں تو میں ان کا اصلی روپ دیکھ کر ڈر جاتا ہوں۔ اصل میں ہماری آنکھیں جھوٹ کی اتنی عادی ہوگئی ہیں کہ سچ کی صورت دیکھ کر ڈر جاتی ہیں۔ انہیں کھڑکیوں سے بیرے کو بلانے کے لئے بار بار بجنے والی برقی گھنٹیوں کی آوازیں بھی سن سکتا ہوں اور بیروں کو "جی صاحب" "حاضر صاحب" "آیا صاحب" کہتا روبوٹ کی طرح دوڑتے بھاگتے سیڑھیاں اترتے چڑھتے بھی دیکھ سکتا ہوں۔ کبھی کبھی رات کے پچھلے پہر شبنم سے بھیگی خاموشی میں چوڑیوں کی کھنک' قہقہوں کا ترنم روٹھنے اور منانے' انکار اور اقرار والی کیفیتوں میں ہونے والی گفتگو کی دبی دبی سرگوشیاں بھی سن سکتا ہوں۔ کبھی کبھی آدھی رات کو کوئی مسافر نشے میں بدمست ہو کر اچانک کسی کمرے کا دروازہ کھولتا ہے تو......... میں آپ کو قطعاً نہیں بتاؤں کہ دروازے کھلنے کے بعد میں کیا دیکھتا ہوں کتنے ہی دروازے ایسے ہوتے ہیں جن کا بند رہنا ہی بہتر ہوتا ہے' کیونکہ جب یہ دروازے کھلتے ہیں تو آنکھیں بھی کھل جاتی ہیں... اور جب آنکھیں کھل جاتی ہیں تو زبان بھی کھل جاتی ہے اور جب زبان کھلی جاتی ہے' تو...........

اس ہوٹل میں تین قسم کے مسافر رہتے ہیں۔ ایک وہ جو میری طرح بے گھر ہیں اور کمرے کا ماہانہ کرایہ دیتے ہیں۔ ایسے مسافروں کو "بے گھر" ہونے کے ناتے نے آپس میں اس طرح جوڑ دیا ہے کہ سب ایک دوسرے کو ایک ہی خاندان کا فرد سمجھتے ہیں۔ دوسری قسم کے وہ مسافر ہیں جو کسی کام کے سلسلے میں دور دراز کی جگہوں سے آتے ہیں اور ہوٹل میں دو چار راتیں گزار کر اپنا کام پورا کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ ایسے مسافروں کو ہم اپنا مہمان سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ میزبانوں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ تیسری قسم کے وہ

مسافر ہیں جو صرف عیاشی کرنے آتے ہیں۔ ایسے مسافر زیادہ تر ٹھیکدار' وڈیرے' جاگیردار' چوہدری اور سرکاری محکموں کے افسر ہوتے ہیں' جو رشوت میں ملی دولت کا صحیح استعمال شراب اور کباب ہی سمجھتے ہیں۔ وہ ساری ساری رات شراب پیتے ہیں۔ پاگل کتوں کی طرح عورتوں کا گوشت نوچتے ہیں۔ ہسٹریائی قہقہے لگاتے ہیں اور چیختے چلاتے ہیں۔ ان کی حالت دیکھ کر مشرقی تہذیب اور اخلاق پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے' کیونکہ ہم سرمایہ دار نہیں ہیں اور سرمایہ داروں کی طرح عیش نہیں کر سکتے۔

مسافروں کی طرح بیروں کا گھر بھی یہی ہوٹل ہے۔ سب بیرے ایک بڑے ایک ہال میں رہتے ہیں۔ سارا دن گھنٹی کی آواز پر سیڑھیاں اترتے اور چڑھتے ہیں۔ رات کو تھکن سے چور ہوکر یا تو چرس پیتے ہیں یا تیل مالش کراتے ہیں۔ یہاں پر ان کا کوئی گھر بار نہیں ہے' کوئی رشتہ دار نہیں اور کوئی ایسی نگاہ نہیں ہے جو ان کے انتظار میں ہر گھڑی دروازے کی طرف اٹھتی ہو اور کوئی ایسی توتلی زبان نہیں ہے' جو گھر میں آتے دیکھ کر کہتی ہو "بابا آگیا' بابا آگیا۔"

ہر مسافر انہیں الہ دین کے چراغ کا دیو سمجھتا ہے' جو گھنٹی کو چھونے سے حاضر ہو جاتا ہے اور ہر ضرورت پوری کر دیتا ہے۔ ان کی نگاہ اتنی تیز ہوتی ہے کہ آپ کو دیکھتے ہی آپ کی جیب کی حالت' سماجی رتبہ اور شخصیت کی کمزوریاں پرکھ لیتے ہے۔ آپ کتنے ہی صاف کپڑے پہن کر آئیں' لیکن ایک ہی نظر میں آپ کے اندر کی حالت دیکھ لیں گے۔

ہوٹل کو گھر سمجھ کر رہنے والوں میں سے' ایک تو میں خود ہوں۔ میں آپ کو اپنے بارے میں کیا بتاؤں۔ ایک گمنام اور بے گھر ادیب ہوں اور جیتے جی زندگی سے فرار حاصل کرکے ذہنی طور پر بن باس اختیار کیا ہے۔ اپنی اجڑی ہوئی زندگی کے ڈھیر پر بیٹھ کر مٹی میں الٹی سیدھی لکیریں کھینچتا رہتا ہوں اور ان لکیروں کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں۔ ٹھوکریں کھا کر ایم۔ اے پاس کیا اور اب ایک پرائیویٹ کالج میں پڑھاتا ہوں۔ پڑھائی کا پیشہ اس لئے اختیار نہیں کیا کہ میں اس پیشے کو مقدس سمجھتا ہوں' وہ دراصل اس لئے اختیار کیا ہے کہ سرکاری افسر نہیں بن سکا اس لئے اپنے پیشے اور سماجی رتبے پر شرمسار ہوں۔

دوسرا ایک صحافی رہتا ہے۔ چھوٹا قد سانولا رنگ اور جسم بھرا بھرا سا ہے وہ ایک مقامی اخبار میں نوکری کرتا ہے۔ تین سو روپے تنخواہ ملتی ہوگی' لیکن اس کا رہن سہن ایسا ہے جیسے نوکر شاہی ملازمت میں کسی ایسے سرکاری شعبہ میں افسر ہو' جہاں تنخواہ لینے کی کوئی ضرورت ہی نہیں پڑتی ہے۔ اس کے پاس ایک نیا اسکوٹر ہے اور شہر کی پوش کالونی میں بنگلہ بھی زیر تعمیر ہے۔ وہ بڑے بڑے راشی افسروں میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ لوگوں سے پیسے لے کر ان افسروں سے ان کے کام کرواتا ہے۔ اس کو شہر کے سارے شراب خانوں' جوا کے اڈوں اور پرائیویٹ قحبہ خانوں سے ماہوار پیسے ملتے ہیں۔ ان ساری باتوں کے باوجود وہ بڑی معصومیت سے کہتا ہے "صحافت کے اپنے اصول اور قدریں ہوتی ہیں اور صحافی ان اصولوں اور اقدار کا رکھوالا ہے۔"

تیسرا ایک ٹی بی کا مریض رہتا ہے۔ دبلا پتلا' خوبصورت اور جوان' اس کی ساری خوبصورتی اور جوانی کو ٹی بی کے جراثیم کھا گئے ہیں اور اب اس کے جسم پر صرف ہڈیاں باقی رہ گئی ہیں۔ جوانی اور خوبصورتی کے دنوں میں وہ موت کے سفر کی تیاری کررہا ہے۔ ہر روز اپنے کمرے کے آگے آرام کرسی ڈال کر بیٹھتا ہے اور دور افق میں گھورتا رہتا ہے۔ افق کے اس پار بھی تو ایک دنیا ہے جدھر سورج ہر روز شام ڈبکی لگا کر گم ہو جاتا ہے۔ جہاں جنت ہے' جہاں حوریں ہیں' سکھ ہے جہاں ٹی بی کا کوئی جراثیم نہیں ہے' کوئی درد نہیں

ہے' کوئی رنج اور غم نہیں ہے' لیکن یہ دکھوں اور درد سے بھری ہوئی دھرتی اتنی پیاری کیوں ہے؟ کیوں روح افق کے اس پار والی دنیا میں جاتے ہوئے چیختی اور چلاتی ہے؟ اس کے پاس بھی تو کچھ خواب ہوں گے۔ اس کا دل بھی تو چاہتا ہوگا کہ کوئی ایسی پیاری آغوش ہو جہاں سر رکھ کر وہ زندگی کے ڈنک برداشت کرسکے۔ خوبصورت اور پیاری انگلیاں ہوں جو پیار سے اس کی پیشانی سے دکھوں کی دھول صاف کریں۔ اس کے لئے تو زندگی ایک بڑا پرانا زخم ہے اور زندگی کی ساری خوبصورتی' رنگ و روپ اس کے جسم سے ٹپکتا ہوا خون کا رنگ ہے۔ شفق کے رنگ' گلاب کے لال پھول' اور کسی دوشیزہ کے گالوں پر لالی کی بہار' سب خون کے ہی تو رنگ ہیں۔

میں نے سنا ہے کہ وہ اپنی دولت مند اور بیوہ ماں کا اکلوتا لاڈلا بیٹا ہے۔ ابھی چھوٹا سا تھا کہ باپ مر گیا۔ چچا بہت زیادہ پیار کرتا تھا' جب جوان ہوا تو چچا نے اپنی خوبصورت اور سلجھی ہوئی بیٹی کا رشتہ دینا چاہا لیکن دو چار ماہ بعد ہی اسے ٹی بی ہوگئی پہلے تو اس نے بیماری کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا اور ٹی بی کے جراثیموں نے اس کے دونوں پھیپھڑوں کو زخمی کر دیا۔ جب وہ بستر پر پڑ گیا تو چچا نے اپنی خوبصورت اور سلجھی ہوئی بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ پیار' دوستی' محبت' رشتے ناطے اور دوسرے اچھے اچھے اور پیارے پیارے رشتے کتنا بڑا جھوٹ ہیں۔ سچ تو صرف ٹی بی کے جراثیم ہیں جو ان جھوٹ پر چڑھے ہوئے خول کو کتر لیتے ہیں اور جھوٹ برہنہ ہوکر ظاہر ہوجاتا ہے۔

ہوٹل کا مالک بھی یہیں رہتا ہے۔ خود تو کوئی ریٹائرڈ پٹواری ہے لیکن اس کا باپ کسی تحصیلدار کے پاس چپڑاسی تھا اور وہ پٹواری کے بعد اس ہوٹل کا مالک ہے۔ وہ خود بدصورت ہے' مگر اس کے بچے بہت خوبصورت ہیں۔ اس کی پوری زندگی پیسوں کا حساب کرتے کرتے خود حساب کی کوئی کتاب بن گئی ہے........ جس میں تفریق' تقسیم اور جمع کے سوا کوئی حرف ہی لکھا ہوا نہیں ہے۔ ہر انسان کے دل کے کسی کونے میں کسی نہ کسی حسین تصور کا چاند ضرور چھپا ہوا ہوتا ہے' لیکن اس ہوٹل کے مالک کے دل کا کوئی روشندان کھول کر دیکھیں یا اس کے دل کے سارے دروازے کھول کر دیکھیں تو آپ کو ہر دروازے اور روشندان کے پیچھے دولت کے ڈھیر نظر آئیں گے۔ ان میں مزید دولت حاصل کرنے کے لالچی اور زہریلے سانپ بل کھاتے نظر آئیں گے۔ کسی بھی دروازے کے پیچھے' کسی حسین تمنا کی دلہن' کسی حسین تصور کا چاند' کسی حسین یاد کا جلتا ہوا دیپ نظر نہیں آئے گا۔ ہر طرف گھپ اندھیرا اور لالچ کے پھنکارتے ہوئے سانپوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے گا۔

صبح ہوتی ہے تو ایک اخبار والا لڑکا ایک ایک کمرے کے آگے آوازیں لگاتا گزرتا ہے۔

"پڑھو' آج کی تازہ خبر پڑھو! اندھے عشق کا اندھا کارنامہ' ایک عورت شوہر کو زہر دے کر عاشق کے ساتھ بھاگ گئی۔"

اس اخبار فروش لڑکے کی عمر مشکل سے آٹھ یا دس سال ہوگی۔ اس کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون میں ابھی جوانی کا شعلہ سلگا ہی نہیں ہے' جو اندھے عشق کو اندھا کارنامہ انجام دلاتا ہے اور اس کو اندھے عشق کا پتہ ہے۔ اس کو مسافروں کی ایک ایک جنسی مسرت کا بھی پتہ ہے' جو ان کو ایسی خبروں سے حاصل ہوتی ہے اور وہ اس سے اخبار خریدتے ہیں۔

رات ہوتی ہے تو تیل مالش والا لڑکا آوازیں لگاتا پھرتا ہے "تیل مالش!....... تیل مالش!"

یہ لڑکے بھی تو کسی ماں کا خواب، کسی تخلیق کا درد اور کسی درد کی دوا ہوں گے۔ ان کی ممتا کی ماری ہوئی ماں نے ان کو نہلا دھلا کر تیل کنگھی کرکے آنکھوں میں سرمہ ڈال کر، ہاتھوں میں کتاب دے کر اسکول بھیجا ہوگا۔ کس نے ان سے وہ کتابیں چھین کر ان کے ہاتھ میں تیل مالش کی شیشیاں اور اندھے عشق کے اندھے کارنامے والے اخبار پکڑا دیئے۔ یہ لڑکے جیتی جاگتی کہانیاں ہیں اور اگر میں آپ کو ان لڑکوں کی کہانیاں سنانا شروع کر دوں تو پھر اس ہوٹل کے ۲۶ نمبر کمرے کی یہ کہانی "الف لیلیٰ" کی داستان بن جائے گی۔ آپ بھی "الف لیلیٰ" والے وہی بادشاہ تو ہیں جن کو کہانی سننے کا بہت شوق تھا اور جو ہر رات نئی کہانی سنتا تھا، لیکن میں "الف لیلیٰ" والی وہ رانی نہیں ہوں جو آپ کو بادشاہوں اور سندھ باد جہازی کی خوبصورت اور جھوٹی کہانیاں سناؤں۔ میں تو آپ کو ان بچوں کی کہانیاں سناؤں گا، جو ہیں تو پھول جیسے بچے لیکن جو پھول کی طرح کھل نہیں سکے۔ جن کے ہاتھوں میں کتابوں کی بجائے تیل کی شیشیاں اور اخبار ہیں۔ آپ یہ پیپ بھری، گندی، خراب اور کوڑھ زدہ کہانیاں سن کر مجھے زندگی کی بقا دینے کی بجائے قتل کر دیں گے۔ اس لئے کہ سچ ہمیشہ سولی پر ہی تو لٹکا ہے۔

جب فصل پک کر تیار ہوتی ہے یا گندم پکنے کا موسم آتا ہے، تب اس ہوٹل کے ایک ایک کمرے میں بہار آجاتی ہے۔ کسی کمرے میں قہقہوں کے پھول کھلتے ہیں تو کسی کمرے سے گھنگھروؤں کی ہلکی جھنکار سننے میں آتی ہے! دو تین بیروں کے سپرد صرف یہ کام ہوتا ہے کہ وہ مسافروں کے لئے شراب کباب اور شباب کا بندوبست کریں، ہوٹل کا مالک دوچار عورتوں کو ہوٹل میں لاکر ٹھہراتا ہے، جن کی صبح سے الاٹمنٹ ہوتی ہے۔ یعنی آج رات وہ فلاں...... فلاں کمرے میں جائے گی وغیرہ وغیرہ۔ ایک دفعہ چار عورتیں آکر ٹھہریں۔ ان میں سے ایک بہت خوبصورت تھی۔ اس کا نام زہری تھا، ویسے تو انگ انگ خوبصورت تھا، لیکن اس کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں، بڑی بڑی کالی اور لمبی پلکوں والی جو کٹاری کی طرح جہاں اٹھتی تھیں قتل کر دیتی تھیں۔ اس نے ایک طوطا پالا ہوا تھا، جس سے سارا دن باتیں کرتی تھی: "پیارے طوطے۔ سدا پھل پھولوں میں رہو۔"

میں بھی اس ہوٹل میں خود اپنی آنکھوں سے لوگوں کو عیش و طرب میں مشغول دیکھتا ہوں، لیکن خود کو شریک نہیں کر سکتا اس لئے نہیں کہ میں کوئی شریف آدمی ہوں، بلکہ اس لئے کہ میں ایک معمولی ادیب ہوں۔ میرے پاس دولت کے ڈھیر کی بجائے جذبوں کے خزانے ہیں۔ اس دنیا میں کھوٹہ سکہ تو چل سکتا ہے لیکن سچا جذبہ نہیں چل سکتا۔ تنخواہ ملتی ہے تو ہوٹل میں کھانے کے پیسے، چائے اور کمرے کا کرایہ ادا کرتا ہوں۔ سگریٹ والے کو پیسے دیتا ہوں، جو باقی بچتے ہیں، ان سے زندگی کی معمولی ضروریات پوری کرتا ہوں۔ ایک دفعہ تنخواہ ملی تو دل میں ایک حیوانی اور وحشی خواہش جاگ اٹھی کہ ان پیسوں سے کچھ عیاشی کر لوں۔ یہ خواہش اتنی شدید اور زبردست تھی کہ سیدھا منیجر کا پاس چلا گیا۔ پچھلے مہینے کا بل ادا کرنے کے بجائے زہری کی الاٹمنٹ کرائی۔ منیجر چونکا اور حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا...... اس کی خوبصورت اور شرمیلی آنکھوں میں ہوٹل کا حساب لکھا ہوا تھا۔ وہ کافی دیر تک آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے ہوٹل کا حساب سمجھاتا رہا لیکن پھر میرے چہرے پر حیوانی اور وحشی خواہش کا سایہ دیکھ کر چپ ہوگیا نیچی نظروں سے اس نے حیرانی، اور لالچی نظروں سے پیسے لے کر رکھ لیے میں اپنے کمرے میں آکر اس گھڑی کے سپنے دیکھنے لگا جب میری وہ وحشی خواہش پوری ہوگی اور زہری میری ویران زندگی میں بہار بن کر آئے گی۔ میری مجبور خواہشوں کے پھول

مچلیں گے' جس کی خوشبو انگ انگ میں سما جائے گی......... کس خوبصورت جملے سے مجھے اس کا استقبال کرنا چاہیے اور پھر اس کے ساتھ گفتگو کرتے وقت کون کون سے جملے استعمال کرنے چاہئیں؟ لیکن میری اس بدحواسی کا کیا ہو گا' جو کسی جوان اور خوبصورت عورت کو دیکھ کر مجھ پر طاری ہو جاتی ہے۔

سارا دن اس طرح کے خیالات کا جال بنتا رہا...... اور بے چینی اور بے قراری سے رات کا انتظار کرتا رہا...... تا آنکہ جب رات نے آنکر پر پھیلائے تو اسی لمحے ستاروں کی آنکھیں ٹمٹمائیں اور اسی طرح وہ گھڑی آئی جب زہری نے میرے کمرے میں قدم رکھا اس کو دیکھتے ہی میں حواس باختہ ہو گیا..... اور احمقانہ سوال کیا۔

"آ گئیں؟"

"دکھائی نہیں دے رہا کہ آئی ہوں۔"

اس نے بے نیازی سے جواب دیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

"آنکھیں تو دیکھ رہی ہیں کہ تم آئی ہو لیکن پتہ نہیں دل کیوں نہیں مان رہا ہے۔"

"پیسے دیئے ہیں' پھر دل کیوں نہیں مان رہا ہے۔"

دراصل پیسوں سے خریدی ہوئی خوشی اتنی جھوٹی ہوتی ہے کہ اس کا یقین ہی نہیں آتا ہے۔"

"پھر کس نے کہا ہے کہ جھوٹی خوشی خریدو۔"

"دل نے کہا ہے' اور کون کہے گا۔"

اس نے سگریٹ نکال کر سلگایا اور چپ چاپ سگریٹ کے کش لینے لگی۔ میں نے اٹھ کر بتی بند کر دی۔

"کیوں ابھی سے بتی کیوں بند کر رہے ہو۔"

"اس لئے کہ تمہارے چہرے کے نور سے بلب بے نور لگ رہا ہے۔"

"اوہو----!" اس نے بھنویں سکیڑ کر اقرار کے انداز میں سر ہلا کر اس انداز میں بولی جیسے میری بات کا مذاق اڑا رہی ہو۔ میں نے خفت مٹانے کے لئے اٹھ کر بتی جلائی اور خاموشی سے یک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"اس طرح سے میری آنکھوں میں کیا دیکھ رہے ہو؟"

"تمہاری آنکھوں کی ان کٹاریوں کو دیکھ رہا ہوں جن سے تم روز قتل کرتی ہو۔"

"باتوں کے ماہر لگتے ہو۔"

"ماہر ہونے کی اس میں کیا بات ہے۔ اس میں جھوٹ تو نہیں تمہاری آنکھیں کٹاری کی طرح ہیں۔ تمہاری خوبصورتی دیکھ کر سوچ رہا ہوں کہ تمہیں تو رانی ہونا چاہیے تھا۔"

"اب رانی نہیں ہوں کیا؟ ذرا غور کرو' میں تو اب بھی تمہارے دل کی رانی ہوں۔"

"تمہیں تو کسی گھر کی رانی بننا چاہیے تھا لیکن تم........"

"لیکن میں طوائف ہوں' یہی کہنا چاہتے ہو نا؟"

"اگر تم طوائف ہو تو اس میں تمہارا کیا قصور ہے مجھے یقین ہے کہ حالات سے مجبور ہو کر تم نے یہ پیشہ

اختیار کیا ہوگا۔"

"حالات نے مجھے طوائف نہیں بنایا...... میں پیدائشی طوائف ہوں۔"

"مانتا ہوں کہ تم پیدائشی طوائف ہو' لیکن کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تمہارا ایک گھر ہو جس کے آنگن میں بیٹھ کر تم بچے کو لوری دو۔"

"اب سر مت کھاؤ اٹھو بتی بند کرو تاکہ نیند کریں۔"

اس نے میری بات کو بیچ میں کاٹ کر کہا۔

"تم بے شک سو جاؤ' لیکن میں نہیں سوؤں گا۔ میں تو ساری رات تمہاری خوبصورتی کو دیکھتا رہوں گا۔"

"جو پیسے خرچ کئے ہیں وہ وصول نہیں کرو گے۔"

"وہ تو اس وقت ہی وصول ہو گئے تھے' جب تم نے میرے کمرے میں قدم رکھا تھا۔"

"تمہاری مرضی۔"

"ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟"

"کیوں نہیں کی ہے۔ مجھے اچھے کپڑوں' زیوروں اور اپنے طوطے سے بہت پیار ہے۔"

"بھلا کسی مرد سے محبت کی ہے؟"

"مرد اس لائق ہے ہی کہ اس سے محبت کی جائے!!"

"اوہ......!"

میں بھویں سکیڑ کر بولا اور اقرار میں سر ہلا کر اس کے انداز کی نقل کی۔ وہ مسکرا دی۔ ہم ساری رات باتیں کرتے رہے۔ میں اس کی خوبصورتی کی تعریف کرتا رہا اور وہ اپنی خوبصورتی کی تعریف سن کر مسکراتی رہی' یہاں تک ہوا میں خنکی رچ گئی جب پو پھٹنے لگی' جب چاروں طرف روشنی پھیل گئی' تب وہ چلی گئی۔

دوسری رات بھی میں نے اسے بلایا اور پو پھٹنے تک اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ تیسری رات بھی میں نے اسے بلایا اور ہم صبح تک باتیں کرتے رہے لیکن...... چوتھی رات' اپنے ساتھ اندھیرا اور اکیلا پن لے آئی۔ تین راتوں میں تین سو روپے خرچ ہو گئے تھے۔ باقی بچاس روپے بچے تھے جن میں سے بیس پچیس روپے خرچ کر چکا تھا اور باقی بچے ہوئے پیسوں سے پورا مہینہ گزارنا تھا۔ ہوٹل کا اور سگریٹ کا بل دینا تھا' لیکن مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی۔ صرف اکیلے پن کا احساس تھا' اس دن پہلی بار مجھے اپنی غربت کا دکھتا ہوا احساس ہوا۔ کل رات اسی کمرے میں زہری کے چہرے کی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے انگ انگ سے خوشبو پھوٹ رہی تھی...... اور آج...... اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو سامنے زہری کھڑی تھی۔

"زہری تم؟"

میں تیزی سے پلنگ پر سے اٹھا۔

"کیوں! نہیں آنا چاہیے تھا مجھے؟ کہو تو واپس چلی جاتی ہوں۔"

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف احمقوں کی طرح منہ کھولے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"اس طرح آنکھیں پھاڑ کر کیوں دیکھ رہے ہو؟"

میں نے پھر بھی اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ آہستہ آہستہ جب حیرت کم ہوئی اور یقین ہو گیا کہ زہری میرے سامنے کھڑی ہے' جس طرح چاندنی رات میں لہرا نھ کر کنارے پر پڑی پیاسی ریت کو سیراب کرتی ہے اسی طرح میرے اندر بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی اور وجود کے ایک ایک ذرے کو سیراب کر گئی۔

"کیا واقعی تم آئی ہو؟" خوشی سے میری باچھیں کھل گئیں تھیں۔

"کیوں آج بھی میرے آنے کا یقین نہیں آ رہا ہے؟"

"کیسے یقین آئے تم تو میرا وہ خواب ہو جس کی کوئی تعبیر نہیں ہے۔ وہ تمنا ہو جس کی کوئی تکمیل نہیں' اور وہ خواہش ہو جس........"

"اب بس بھی کرو خواہ مخواہ کی باتیں کر کے میرا سر مت کھاؤ۔" اس نے سگریٹ سلگائی اور کش لیتے ہوئے بولی۔

"آج رات کیوں نہیں بلایا۔"

"پیسے ختم ہو گئے تھے اس لئے نہیں بلایا؟"

"کیا کرتے ہو؟"

"کالج میں پڑھاتا ہوں۔"

تنخواہ کتنی ملتی ہے؟"

"کہتے ہیں کہ عورت سے عمر اور مرد سے تنخواہ نہیں پوچھنی چاہیے' لیکن خیر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ساڑھے تین سو روپے تنخواہ ملتی ہے۔"

"ساڑھے تین سو میں سے تین سو تو میں لے گئی ہوں۔ باقی پچاس روپے بچے ہوں گے۔ پچاس روپے میں مہینہ کیسے گزارو گے۔"

"سنا نہیں ہے کہ دانے دانے پر کھانے والے کی مہر لگی ہوتی ہے۔ جن دانوں پر میرا نام لکھا ہو گا وہ کھاؤں گا۔"

اس نے پرس کھول کر سو روپے کے تین نوٹ نکال کر میری طرف بڑھائے اور بولی......

"یہ لو۔"

"کیوں؟"

"تین راتیں تم نے صرف مجھ سے باتیں کی ہیں اور میں صرف باتوں کے پیسے نہیں لیتی۔"

"زہری تم پیسے واپس کر کے میری غربت کا مذاق اڑا رہی ہو۔"

"مذاق کی اس میں کون سی بات ہے۔"

"تم دوسروں سے پیسے لیتی ہو۔ میں اس لائق بھی نہیں کہ تم مجھ سے پیسے لو۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔"

"تم مجھے غریب سمجھ کر، میری غربت پر ترس کھا کر پیسے واپس کر رہی ہو۔"

"تم بات کیوں نہیں سمجھ رہے ہو۔"

"میں کچھ بھی سمجھنا نہیں چاہتا۔ مہربانی کرکے پیسے اپنے پاس رکھ لو۔"

"جو تمہاری مرضی۔" اس نے پیسے واپس اپنے پرس میں رکھے اور کمرے میں ناگوار سی خاموشی چھا گئی۔

اس رات بھی ہم صبح تک باتیں کرتے رہے، لیکن اس رات میرے دل میں کانٹا سا چبھتا رہا اور وہ ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی جیسے مجھے منا رہی ہو۔

اس دن صبح کو میں کراچی چلا گیا اور ایک دوست سے پیسے لے کر دوسرے دن واپس آیا۔ سیدھا منیجر کے آفس میں گیا۔۔۔ اور اس سے ہوٹل کا بل پوچھا۔ منیجر نے معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

"آپ کا بل ادا ہو چکا ہے۔"

"لیکن میں نے تو بل ادا ہی نہیں کیا!!"

"آپ نے تو ادا نہیں کیا تھا، لیکن آپ کا بل ادا ہو چکا ہے۔"

اس نے اپنی مسکراہٹ مزید معنی خیز بناتے ہوئے کہا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی مسکراہٹ میرا مذاق اڑا رہی ہو۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں جب میں نے بل ادا ہی نہیں کیا تو پھر میرا بل کیسے ادا ہو گیا؟"

"آپ کا بل زہری نے ادا کر دیا ہے۔"

اس کے الفاظ بجلی بن کر میرے دل پر گرے اور جسم کی پوری بستی کو بھسم کر دیا۔

یوں محسوس ہوا جیسے بیچ چوراہے پر کھڑا ہوں اور لوگوں کا ہجوم میری ہنسی اڑا رہا ہو۔ میں نے منیجر کی طرف دیکھا، اس کے ہونٹوں پر ویسی ہی مسکراہٹ تھی اس کی مسکراہٹ مجھے سانپ بن کر ڈسنے لگی۔ پورے جسم میں زہر بھر گیا۔ نیم جان سے عزت نفس نے کالے سانپ کی طرح پھن اٹھایا اور پورا جسم آگ میں جلنے لگا۔ غصہ میں ہانپتا کانپتا سیڑھیاں پھلانگتا زہری کے کمرے میں پہنچ گیا۔ زہری بیٹھی طوطے سے باتیں کر رہی تھی مجھے دیکھ کر مسکرائی، لیکن پھر میرے چہرے کو غصہ میں لال پیلا دیکھ کر اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ حیران ہو کر پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"تم نے یہ کیا کیا ہے؟"

"کیا کیا ہے؟"

"مجھے ذلیل اور خوار کرکے پوچھ رہی ہو کہ کیا کیا ہے؟ تم نے میرا ہوٹل کا بل کیوں ادا کیا ہے یہ بتانے کے لئے کہ تم امیر ہو اور میں مفلس ہوں اور تم مجھے پال سکتی ہو۔ کان کھول کر سن لو میں مفلس ہوں، غریب ہوں، لیکن عزت سے کما کر کھاتا ہوں تمہاری طرح دھندا نہیں کرتا! سمجھیں؟"

میری بات سن کر اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور میں ہانپتا کانپتا جیسے ہی کمرے کی طرف مڑنے لگا تو یوں محسوس ہوا جیسے ایک ایک قدم من بھر کا ہو گیا ہو۔ گلے میں کوئی چیز اٹکی اور سانس گھٹنے لگا۔ سارا جسم پسینے میں تر ہو گیا۔ جسم کی ساری رگیں اور شریانیں تنبور کے تاروں کی مانند اس طرح کھینچ کر سختی سے تن گئیں کہ یوں محسوس ہونے لگا جیسے ایک قدم بھی آگے بڑھا تو پورے جسم کی رگیں اور شریانیں کچے دھاگوں کی مانند ٹوٹ جائیں گی۔ جیسے تیسے کر کے زہری کے کمرے سے نکلا اور گرتا پڑتا اپنے کمرے میں پہنچا سوچنے لگا کہ.......

اچھا کیا کہ اسے ذلیل کیا۔ بڑی آئی مجھے پالنے والی! غریب ہوں تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ میری کوئی عزت نہیں ہے۔ اس سے زیادہ عزت دار ہوں۔ دو ٹکے کی طوائف خود کو پتہ نہیں کیا سمجھ رہی ہے۔ میری بے عزتی کی اور میں چھوڑ دیتا۔

اچھا کیا جو میں نے اس کو بے عزت کیا لیکن اس نے مجھے بے عزت کرنے کے لئے تو ایسے نہیں کیا تھا۔ اس نے تو اپنا پیار دکھانے کے لئے میرا بل ادا کیا تھا۔ میں نے اس کے پیار کا اچھا بدلہ دیا ہے۔ اچانک کسی غیبی ہاتھ نے میرا دل جکڑ لیا اور پورا جسم سن ہو گیا پھر مجھے ہوش نہیں رہا جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو زہری کی گود میں سر رکھے روتے پایا۔

"مجھے معاف کر دو زہری! میں نے تم سے بہت ذلیل برتاؤ کیا ہے۔ اس وقت مجھے پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا۔ میں ہوش میں نہیں تھا۔ زہری مجھے تم سے محبت ہے۔ اتنی محبت کہ میں تمہارے لئے آسمان میں دراڑ ڈال سکتا ہوں۔ ہوٹل کی چھٹی منزل سے چھلانگ لگا سکتا ہوں' مجھے معلوم ہے کہ میں غریب ہوں اور تم امیر ہو۔ میں زمین کا ذرہ ہوں اور تم آسمان کا چاند ہو' لیکن پھر بھی مجھے تم سے محبت ہے اگر میں تم کو حاصل نہیں کر سکا تب بھی میں تم سے محبت کرتا رہوں گا۔ زندگی جب بھی کوئی نیا زخم لگائے گی' جب بھی کسی نئے ظلم کی زنجیر پہنائے گی اور میں دکھ کی آگ میں جلنے لگوں گا' تب تمہاری یاد کی گود میں منہ چھپا کر روؤں گا اور تمہیں پکاروں گا۔ تم بھی جس وقت بہت زیادہ خوش ہو' زندگی کے عیش اٹھا رہی ہو' ہونٹوں پر قہقہے ہوں تب مجھے یاد کرنا' سمجھنا کہ کوئی غریب' مفلس اور نادار انسان تم کو یاد کر رہا ہے۔ تمہاری مہربان یاد کی گود میں منہ چھپا کر رو رہا ہے۔"

"بس کرو خدا کے واسطے بس کرو۔ تم خود تو پاگل ہو لیکن مجھے بھی پاگل کر دو گے۔"

پھر تو میرے آنسوؤں کا سیلاب بند توڑ کر بہہ نکلا جیسے جیسے وہ تسلی دیتی رہی' اتنا ہی میرا دل پھٹنے لگا۔

اور پھر زہری اپنے سامان سمیت میرے کمرے میں منتقل ہو گئی اور ہم دونوں ساتھ رہنے لگے۔ ہم نے زبان سے تو ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا وعدہ نہیں کیا تھا' لیکن ہمارے دل میں جو پیار کے چراغ جل اٹھے تھے ان کی روشنی میں ہماری روحوں نے ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے وعدے کر لئے تھے' اور میں پاتالوں میں رہنے والا انسان آسمان پھلانگ کر عرش پر جا پہنچا۔ پاؤں میں ستاروں کے کنول تھے' گود میں چاند اتر آیا تھا اور بالوں میں شبنم کے قطرے تھے۔ زہری کی زندگی میں بھی عجیب انقلاب آ گیا تھا اس کی روح اور جسم پیار میں اتنا رچ گیا کہ اس کے انگ انگ سے پیار بہہ نکلا اور میری بے رنگ ازل سے پیاسی زندگی سیراب ہو گئی۔ اس کی بڑی بڑی کالی خوبصورت آنکھوں میں خوابوں کا جہان آباد ہو گیا تھا۔ پیار میں اس کا انگ انگ کھل اٹھا اس

کو دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ان چھوئی البیلی بوٹی تھی جسے میں نے اگر ہاتھ بھی لگایا تو شرم سے دوہری ہو کر اپنے کنوارے پن کے ہزار حجابوں میں چھپ جائے گی اور میں اس کو ڈھونڈ نہیں پاؤں گا۔ اس کا پیار اتنا اتھاہ اور بے پناہ تھا کہ میری ہستی ان کی وسعتوں اور گہرائیوں میں غرق ہو گئی۔ رات کے اندھیرے اور ستاروں کی ہلکی اور ٹھنڈی روشنی میں بیٹھ کر ہم دونوں باتیں کرتے رہتے' خواہ مخواہ کی اور بے معنی سی باتیں۔ جیسے دو بچے آپس میں بے کار سی اور بے معنی باتیں کرتے ہیں' لیکن ان باتوں کے ایک ایک لفظ میں ہمارے پیار میں رچی ہوئی روحیں چھپی ہوتی تھیں۔ ہمارا پیار ایک ایک لفظ کی صورت میں قطرہ قطرہ بن کر ہمارے دل کے پیالے میں ٹپکتا تھا۔ کبھی کبھی میں آسمان کی نیلی جھیل میں کھلتے ہوئے ستاروں کے کنول دیکھ کر کہتا تھا "پتہ ہے یہ ستارے کون ہیں؟"

"کون ہیں؟"

"ان لوگوں کی روحیں ہیں' جنہوں نے ہماری طرح زندگی گزاری' جب ہم مر جائیں گے' تب ہماری روحیں بھی اسی طرح ستارے بن کر آسمان میں ٹمٹمائیں گی۔"

"میں مر جاؤں گی تو میری روح......... وہ بڑا ستارہ دیکھ رہے ہو نا جو سب سے زیادہ چمک رہا ہے۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا ستارہ بن کے تمہاری طرف دیکھوں گی۔"

"ایسی باتیں منہ سے مت نکالو۔"

"واقعی۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں جلد ہی مر جاؤں گی میں اتنی خوش ہوں کہ ڈر لگتا ہے کہ اسی خوشی میں مر نہ جاؤں۔ سچ بتاؤ اگر میں مر جاؤں تو تم مجھے یاد کرو گے؟"

"میں تمہیں اکیلا نہیں مرنے دوں گا۔ تمہارے ساتھ میں بھی مر جاؤں گا۔"

زہری میری اتنی خدمت کرتی کہ میں دل ہی دل میں شرمسار ہوتا رہتا تھا۔ ایک دن جوتا لا کر میرے پاؤں کے پاس رکھا تو میں نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔ "یہ کیا کر رہی ہو۔"

"کیوں؟ کیا کر رہی ہوں؟ میں تمہاری خدمت کے لائق نہیں ہوں۔"

"اتنی خدمت کر کے شرمندہ مت کیا کرو۔"

"تم کس لائق ہو تمہیں کیا پتہ۔"

"مجھ سے پوچھو اگر میرے بس میں ہو تو میں تمہاری اتنی خدمت کروں کہ تمہیں تنکا بھی نہ اٹھانا پڑے' لیکن میں عورت ذات اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتی ہوں۔"

میں نے ایک دفعہ اس سے پوچھا "زہری تم نے اپنا طوطا کیوں اڑا دیا؟"

"اب جو طوطا پالا ہے۔"

"کہاں ہے وہ طوطا۔ میں بھی تو دیکھوں۔"

"یہ ہیں نا!" وہ انگلی میرے سینے پر رکھتے ہوئے بولی۔

"اس طوطے پر اعتبار مت کرنا' موقعہ ملا تو اڑ جائے گا!"

"میں نے پر کاٹ دیئے ہیں' اب کہاں اڑ سکے گا۔"

"اور اگر پر دوبارہ نکل آئیں تو؟"

"تو پھر کاٹ دوں گی' اس کو تو ایک پنجرے میں بھی بند کیا ہے۔"

"کون سے پنجرے میں اس بے زبان کو بند کیا ہے؟"

"یہ دل کا پنجرہ جو ہے!"

"اوہو!" میں نے بھی اس کے انداز کی نقل کرکے بھنویں سکوڑیں گردن کو اقرار میں ہلایا۔ ہم دونوں کا قہقہہ نکل گیا۔

ایک رات کالج سے لوٹا تو مجھے دیکھتے ہی زہری کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور پھر اس کے گالوں پر حیا کے دیئے جل اٹھے۔

"کیا بات ہے آج بہت خوش نظر آرہی ہو؟"

"پہلے منہ میٹھا کراؤ تو پھر بتاؤں گی۔"

"یہاں آؤ تاکہ منہ میٹھا کراؤں۔"

"چھوڑو تمہیں تو ہمیشہ مذاق کی سوجھتی ہے۔"

"اچھا تو پھر ہم وہ خوش خبری نہیں سنتے۔"

"نہیں سنو گے تو پچھتاؤ گے۔"

"ابھی بتا دو گی' عورت کے پیٹ میں بات کہاں ٹھہرتی ہے۔"

"اس خیال میں مت رہنا' ہرگز نہیں بتاؤں گی۔"

"اچھا کیسے بتاؤ گی۔"

"مٹھائی کھلاؤ گے تو پھر بتاؤں گی۔"

"اچھا سائیں ہم مٹھائی کھلانے کا وعدہ کرتے ہیں' اب تو بتاؤ۔"

اس نے نگاہیں جھکا لیں اور اپنے آنچل کا پلو انگلیوں پر لپیٹنے لگی۔ اس کے دل میں کوئی بات تھی جو گلے میں اٹک گئی تھی۔ اس کے اندر عجیب سی ہلچل تھی' جس کا سایہ حیا کی لالی کی صورت میں اس کے گالوں پر شفق بن کر کھل رہا تھا۔

"کیسے بتاؤں کہ میں........ ماں بننے والی ہوں۔"

"ہیں!" میرے منہ سے بے اختیار چیخ سی نکل گئی اور ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگا۔ وہ دوڑ کر پلنگ پر جا بیٹھی اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ میرے تو ہوش ہی اڑ گئے تھے۔ بات ہی سمجھ میں نہیں آرہی تھی' پھر جب بات سمجھ میں آئی تو دوڑ کر اس کے پہلو میں جا بیٹھا۔ اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹائے تو اس کے چہرے پر فتح' حیا' اور خوشی کی ملی جلی کیفیات مسکراہٹ بن کر چھلکنے لگیں۔ میں نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔

اس رات ہم ایک پل کے لئے بھی نہیں سوئے ساری رات باتیں کرتے رہے۔ ہر پل کوئی چھوٹا سا شیر

خوار بچہ ہماری گود میں لیٹا ہمک رہا ہوتا تھا۔ آج کی رات کتنی حسین تھی۔ آج رات زندگی کے تکون کی تکمیل ہو گئی تھی۔ آج کی رات ہماری روحیں بدن کا قرض چکا کر ہلکی پھلکی ہو کر عرش کی طرف اڑ گئی تھیں کسی کے استقبال کے لئے عرش کے ایوانوں میں چراغاں کیا گیا تھا اور حوریں کسی بچے کو ستاروں سے جڑے ہوئے پالنے میں جھولا دے رہی تھیں۔

"اگر بیٹا ہوا تو کیا نام رکھو گے؟"

"ایسے ہی جمعہ' ہفتہ یا اس قسم کا کوئی نام رکھ لیں گے۔"

"مذاق مت کرو' کوئی اچھا سا نام بتاؤ۔"

میں نے اس کو کئی نام بتائے لیکن اسے پسند نہیں آرہے تھے۔

"نام پھر سوچیں گے' پہلے بتاؤ ہمارے بچے کی شکل تمہاری طرح ہوگی یا میری طرح ہوگی۔"

خدا کرے تم جیسا ہو۔"

"کیوں! میری طرح کیوں ہو۔ تمہارے جیسا کیوں نہ ہو؟"

"اگر تمہارے جیسا ہوگا پھر مجھے بہت اچھا لگے گا۔"

"اگر تمہاری طرح ہوگا تو مجھے اچھا لگے گا۔"

اگر میری طرح ہوگا تو میں اس کو دن رات جوتے لگاؤں گا۔"

"کیسے مارو گے۔ میرے بچے کو ہاتھ تو لگا کر دیکھنا۔"

"پگلی اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ خدا کرے کہ تم جیسا ہو۔"

"اچھا اس کو پڑھاؤ گے کہاں؟"

"ایسے ہی کسی مدرسے میں داخل کرا دوں گا۔"

"میں تو اپنے بچے کو مدرسے میں داخل نہیں کراؤں گی۔ میں تو اس کو انگریزی پڑھاؤں گی۔ انگریزی پڑھ کر بڑا افسر بنے گا' پھر شادی کراؤں گی لیکن...... اگر اس کو پتہ چل گیا کہ تم سے شادی سے پہلے میں ایک......

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔"

صبح کو وہ تیار ہو کر کھڑی ہو گئی۔

"چلو بازار چلیں۔"

"کس لئے؟"

"بچے کے کپڑے اور کھلونے خریدنے ہیں۔"

ابھی سے کپڑے اور کھلونے خرید رہی ہو۔"

"پھر نہیں تو کب خریدیں گے۔"

میں اس کو بازار لے گیا اور اس نے اتنے کپڑے اور کھلونے خریدے کہ اٹھانے مشکل ہو گئے۔ ایک چھوٹا سا جھولا اور پلاسٹک کا گڈا بھی خریدا۔ ہوٹل میں واپس آئے تو وہ گڈے کو گلے لگا کر پیار کرنے لگی۔

اب وہ سارا دن اس گڈے کو جھولے میں جھلاتی رہتی اور لوریاں دیتی رہتی تھی اور توتلی زبان میں اس سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ میں شام کو کالج جاتا تھا اور رات کو واپس آتا تھا تو وہ گڈے کو اٹھا کر کہتی تھی "وہ دیکھو تمہارے بابا آ گئے۔ بابا کو سلام کرو۔" پھر گڈے کا ہاتھ سلام کے انداز میں پیشانی پر رکھ کر کہتی۔

"بابا سلام"

"وعلیکم اسلام"

اگر کبھی بے خیالی میں سلام کا جواب نہیں دیتا تھا تو ناراض ہو جاتی تھی۔ "تم نے میرے بچے کے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا۔"

"سائیں غلطی ہو گئی' معافی مانگ رہے ہیں' پھر دوبارہ ایسی غلطی نہیں کریں گے۔"

زہری بہت خوش تھی۔ اتنی خوش کہ آج اس بات کا اعتراف کر رہا ہوں کہ مجھے اس کی خوشی سے حسد سا محسوس ہونے لگا تھا۔ جب سے وہ حاملہ ہوئی تھی' تب سے وہ اپنے بچے کے خوابوں میں اتنی گم ہو گئی تھی کہ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ میرے قریب ہوتے ہوئے بھی مجھ سے دور ہو' جیسے ہم دونوں کی زندگی کی راہیں تھوڑی دیر کے لئے ایک دوسرے سے ملیں اور پھر الگ ہو گئی ہوں۔ اس کی منزل دوسری تھی اور میری دوسری تھی۔ عورت تخلیقی منزل کی مسافر ہوتی ہے اور مرد اکیلے پن کا مسافر۔

پانچویں مہینے میں جب اس کے پیٹ میں بچے نے حرکت کی تو وہ بہت خوش ہوئی' جیسے پوری کائنات سمٹ کر اس کے پہلو میں بس گئی ہو اور......

اور.......... ایک دن جب میں کالج گیا تو پرنسپل (جو کالج کا مالک اور منیجنگ ڈائریکٹر بھی تھا) نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہنے لگے "مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے۔ "آپ کہاں رہتے ہیں؟"

"ہوٹل میں رہتا ہوں۔"

"اکیلے رہتے ہیں یا بچوں کے ساتھ۔"

"اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہوں۔"

"معاف کیجئے گا۔ میں آپ سے ایک ذاتی سوال پوچھ رہا ہوں کہ آپ کی بیوی کون ہے؟"

"عورت ہے اور کون ہو گی۔"

میں تھوڑا بوکھلا سا گیا۔

"عورت تو ہے لیکن عورتوں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں میں نے سنا ہے کہ آپ کی بیوی...... معاف کیجئے گا۔"

"پہلے تھی' لیکن اب شریف بن گئی ہے۔"

"آپ نے نکاح کیا ہے۔"

"نہیں......"

"آپ پڑھے لکھے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ معاشرے نے ہم کو ایک عظیم کام سونپا ہے۔ اپنی آنے والی نسل کے رکھوالے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ آپ کی ذاتی زندگی کا آپ کی نوکری سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے' لیکن شاگرد کی نفسیات ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنے استاد کی زندگی کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا ہے' اس لئے کہ استاد اس کا آدرش ہوتا ہے' اسی لئے استاد کی زندگی کا اس کی نوکری سے براہ راست تعلق بن جاتا ہے۔ جب شاگردوں کو آپ کی ذاتی زندگی کے بارے میں پتہ چل جائے گا تو پھر آپ سمجھ رہے ہیں ناکہ ان کے ذہنوں پر کیا اثر پڑے گا؟ جس نسل کے سامنے ان کا آدرش ہی اونچا نہیں ہوگا وہ نسل بڑی ہوکر اخلاق اور جنسی لاقانونیت کا شکار ہو جائے گی' اس لئے میں اپنی قوم کی آنے والی نسل کی اخلاقی پرورش کو سامنے رکھ کر بڑے افسوس کے ساتھ آپ کو بتا رہا ہوں کہ آج سے آپ کی نوکری ختم ہے۔ آپ جیسے قابل استاد سے یہ کالج محروم ہو جائے گا جس کا مجھے بہت زیادہ دکھ رہے گا........ لیکن کیا کیا جائے۔ کبھی کبھی کچھ کام اپنی مرضی اور خوشی کے خلاف بھی کرنے پڑتے ہیں۔"

اس کا ایک ایک لفظ سانپ بن کر میرے جسم سے میری سانس چوس رہا ہو اور مجھ میں اتنی طاقت بھی نہ رہی کہ اپنے بچاؤ کے لئے ایک لفظ بھی بول سکوں۔ پرنسپل نے اکاؤنٹنٹ کو بلایا اور مجھے ایک مہینے کا ایڈوانس دلا کر رخصت کیا تو اس کی آنکھوں میں ہمدردی کے آنسو تیر آئے۔

میں کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح قدم اٹھاتا باہر نکل آیا اور کالج کی دہلیز پر کھڑا ہو گیا۔ گردن موڑ کر آخری دفعہ کالج کی عمارت کو دیکھا۔ پہلے دن جب میں نے نوکری کرنے کے لئے یہ دہلیز پار کی تھی' تب کالج کی عمارت نے ماں کی طرح اپنی باہیں پھیلا کر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا تھا' لیکن آج اس طرح دھتکار دیا تھا جیسے میں اس کا سوتیلا بیٹا تھا۔ شاید میں زندگی کا بھی سوتیلا بیٹا تھا۔ اس نشیب و فراز والے شہر کا بھی سوتیلا بیٹا تھا' آج سب نے مل کر مجھے دھتکار دیا تھا۔ میں اکیلا' بیگانہ اجنبی اور غیر محفوظ اس کالج کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ سامنے شہر کی شاہراہ پھیلی ہوئی تھی' جس پر کاروں' رکشا اور ایک دوسرے کو مارنے' کچلنے کی سازشیں کرنے والے خوبصورت چہروں اور دھواں ہوتے دل والے لوگوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔

آخر یہ بھاگ دوڑ' چیخ و پکار' جدوجہد کس لئے ہے؟

کیا مجھ جیسے سوتیلے بیٹوں کو جینے کا حق نہیں؟ ہم نے تو سماجی سمجھوتہ اس لئے کیا تھا کہ سوتیلے بیٹے بھی قانون کی پناہ میں جی سکیں' لیکن یہاں تو آج بھی وہی جنگل کا قانون رائج ہے۔ آج بھی طاقتور کمزور کو چیر پھاڑ کر اس کی ہڈیاں تک چبا کر زبان سے باچھوں کا خون صاف کرکے بڑے آرام سے ڈکار لیتا ہے اور قانون اپنی ساری ہیبت دبدبے اور عظمت کے ساتھ آنکھوں پر پٹیاں باندھے ہاتھ میں انصاف کا وہ ترازو لئے کھڑا ہے' جس کے پلڑے کبھی برابر نہیں ہوئے اور جس میں ہمیشہ کمی ہی رہتی ہے۔

کمرے میں قدم رکھا تو زہری مجھے دیکھ کر ہراساں ہوگئی اور بڑی دہشت زدہ آواز میں بولی۔ "میرے چھوٹے کو پتہ نہیں کیا ہوگیا ہے۔"

"کیوں کیا ہوگیا ہے؟"

"رات سے حرکت نہیں کر رہا ہے۔"

میں اپنے دکھ لے کر اس کے پاس آیا تھا اور وہ اپنے بے کار دکھ لے کر بیٹھ گئی تھی۔ مجھے غصہ آگیا اس لئے چڑ کر بولا تمہارا دماغ خراب ہے۔ یہ بچہ تمہیں پاگل کر دے گا میں نے جو جھڑکا تو پگھل گئی روتے ہوئے کہا۔

"میرے بچے کو کچھ ہو گیا ہے۔ ویسے تو ہر وقت پیٹ میں حرکت کرتا رہتا تھا' لیکن رات سے حرکت ہی نہیں کی۔ کہیں...... کہیں اسے کچھ ہو نہ گیا ہو۔"

میں نے اسے گلے لگایا اور دلاسہ دیتے ہوئے بولا "پگلی کبھی کبھی بچے دم سادھ لیتے ہیں اور ہفتوں حرکت نہیں کرتے تم بے کار وہم کر رہی ہو۔"

"دل کو بہت سمجھا رہی ہوں لیکن دل نہیں مانتا۔ دل پر کوئی بوجھ سا آپڑا ہے' یوں لگ رہا جیسے کوئی خوف ناک بات ہونے والی ہو' جیسے کچھ ہو چکا ہو یا ہونے والا ہو۔ خدا نخواستہ میرے بچے کو کچھ ہو گیا تو میں مر جاؤں گی' تباہ ہو جاؤں گی۔"

میرے سینے میں منہ چھپائے وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

میں نے اسے کہا کہ "حاملہ عورت کا کبھی کبھی دم سا گھٹنے لگتا ہے' دل پر غبار چڑھتے ہیں خواہ مخواہ کے وہم کر رہی ہو' کچھ نہیں ہے' خدا رحم کرے گا۔ اب ذرا ایک دفعہ ہنس کے تو دکھاؤ۔ میری وجہ سے ہنسو' نہیں ہنس رہی ہو؟ اچھا پھر میں بھی تم سے نہیں بولتا۔ اب بھی نہیں ہنس رہی ہو؟ اچھا دیکھتا ہوں کیسے نہیں ہنسو گی!"

میں نے اسے گدگدایا تو اس کے ہونٹوں پر سسکتی ہوئی مسکراہٹ آئی۔ میں اپنے دکھ بھول گیا اور اس کا دل بہلانے کے لئے اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ کسی وقت تو ہنس دیتی اور کسی وقت اس کے چہرے پر غم کے اندھیرے چھا جاتے۔ رات کو سوتے وقت میں نے بتی بجھائی تو فوراً اٹھ بیٹھی اور تیزی سے بولی "بتی جلاؤ اندھیرے میں میرا دل گھبرا رہا ہے' دم گھٹ رہا ہے۔"

میں نے اٹھ کر بتی جلائی اور وہ ساری رات سو نہ سکی اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتی تھی "پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا ہے جانے حرکت کیوں نہیں کر رہا!"

دوسرے دن صبح ہی صبح میں ڈاکٹر کو لے آیا۔ ڈاکٹر نے جو اس کو سہما ہوا دیکھا تو اسے تسلی دینے لگی اور معائنہ کرنے کے بعد اطمینان سے مسکراتے ہوئے کہنے لگی "بے کار اپنی حالت خراب کرلی ہے کچھ نہیں ہوا' بچہ بالکل ٹھیک ہے تھوڑا کمزور ہو گیا ہے۔ اس لئے حرکت نہیں کر رہا اور اگر حرکت کر بھی رہا ہے تو اس طرح کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ باقی فکر کی کوئی بات نہیں۔"

ڈاکٹر کی بات سن کر وہ خوش ہو گئی۔ میں ڈاکٹر کے ساتھ نیچے اترا تو وہ کہنے لگی "میرا خیال ہے کہ بچہ مر چکا ہے انہیں فوراً بڑے ہسپتال لے جائیں اگر دیر ہو گئی تو زہر پھیل جائے گا۔ ایک بات کا خیال رکھیئے گا کہ انہیں پتہ نہ چلے کہ بچہ مر چکا ہے۔" ڈاکٹر کی بات سن کر میرا دل ٹوٹ سا گیا۔ جسم کانپنے لگا' ٹانگوں میں کپکپاہٹ ہونے لگی اور سر گھومنے لگا' یوں لگا جیسے ابھی گر پڑوں گا۔ سیڑھی پر قدم رکھا تو دماغ اتنی زور سے چکرایا کہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ پتہ نہیں کتنی دیر گزر گئی۔ بہت دیر تک میں دونوں ہاتھ سر پر رکھے وہیں

سیڑھیوں پر بیٹھا رہا۔ اچانک خیال آیا کہ اگر زہری نے میری یہ حالت دیکھ لی تو سب کچھ سمجھ جائے گی' پھر کیا ہوگا۔ فوراً کھڑا ہو گیا اور بڑے اطمینان سے مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی مسکرانے لگی۔

"میں نے کہا تھا نا کہ بے کار کے وہم مت کیا کرو۔"

"کیا کروں انسان کا اپنے دل پر بس تھوڑی ہوتا ہے۔"

"ارے یہ دوسری بات سنو۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ بچہ بہت کمزور ہو گیا ہے اور اسے پوری خوراک بھی نہیں پہنچ رہی ہے۔"

"پھر؟......." وہ سہم گئی۔

"فکر کرنے کی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ بچے کو ابھی پیدا ہونا چاہیے۔ آٹھ مہینے تو ویسے بھی اسے پیٹ میں ہو گئے ہیں ابھی ڈاکٹر تمہیں ایک سوئی لگائے گا پھر ہمارا چھوٹا ہماری گود میں ہوگا۔ اسے اتنا دودھ پلائیں گے کہ پہلوان بن جائے گا اور اپنے خم ٹوک کر کہے گا۔ "بابا مجھ سے کشتی لڑو گے؟" میں اسے کہوں گا "نہیں بیٹا میں کمزور آدمی تم سے کشتی نہیں لڑ سکتا ہوں۔" بات کرتے کرتے دل بھر آیا لیکن فوراً خود پر قابو پا لیا۔ میں نے اسے راضی کر لیا اور ہم اسی وقت بڑے ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک ڈاکٹر مجھے پہچانتی تھی' اتفاق سے وہ مل گئی اس نے اچھی طرح زہری کا معائنہ کیا کہنے لگی کہ "بچہ مر چکا ہے" اس لئے فوری طور پر آپریشن کرنا پڑے گا' نہیں تو مریضہ کے اندر زہر پھیل جائے گا۔ ایک دوسری بات میں آپکو بتا دیتی ہوں اور مریضہ کو شاید پھر کبھی اولاد نہ ہو سکے۔"

"مجھے بچے کی ضرورت نہیں ہے مجھے اپنی بیوی کی زندگی عزیز ہے۔"

زہری کو اسی وقت آپریشن تھیٹر میں پہنچایا گیا۔ وہ بہت سہمی ہوئی تھی۔ وہ اس طرح خوفزدہ آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی جیسے اسے مقتل کی طرف لے جایا جا رہا ہو۔

آپریشن تھیٹر کا دروازہ بند ہوا اور میں برآمدے میں چکر کاٹنے لگا۔ عجیب خیال ذہن میں دوڑنے لگے۔ سر گھومنے لگا اور ٹانگوں میں کپکپی سی ہونے لگی۔ پورے جسم سے سانس نکلتی ہوئی لگی اور میں وہیں برآمدے میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا میری آنکھوں میں اندھیرا پھیلنے لگا' اور پھر رونا دھونا گلے سڑے گوشت کی بدبو' جیتا جاگتا خون چاروں طرف سے بے کفن مردوں کا ناچ ڈھاریں اور آدم بو' آدم بو کی آوازیں' چونک کر آنکھیں کھولیں تو سامنے نرس کھڑی تھی۔

"مبارک ہو آپریشن کامیاب ہوا ہے۔"

اتنے میں زہری کو آپریشن تھیٹر سے اسٹریچر پر باہر لے آئے۔ اس کی آنکھیں بے جان سی آدھی کھلی اور آدھی بند' گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی اور جسم ساکت تھا۔ زہری پلنگ پر بے ہوش پڑی ہوئی تھی اور میں سگریٹ کے کش لگاتا بے چینی سے کمرے میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ زہری کا آپریشن کامیاب ہوا تھا کیونکہ اس کا بڑا آپریشن کیا گیا تھا۔ اس لئے اب وہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔ اب جب وہ آنکھیں کھولے گی اور اپنے بچے کا پوچھے گی' تب میں اسے کیا جواب دوں گا۔ اسے کیسے بتاؤں گا کہ اس کا بچہ جس کے لئے اس نے جاگتے سپنوں

کے ہزار جتن بتائے تھے۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گیا۔ کسی ممتا کی ماری ہوئی ماں کو اس کے بچے کی موت کی خبر سنانا کتنی دل دہلانے والی بات ہوگی' لیکن حقیقت کو کیسے چھپایا جائے۔ آخر کار وہ گھڑی آگئی' جس سے میں ڈر رہا تھا۔ زہری نے آنکھیں کھولیں اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"پانی......پانی"

میں نے اسے گلوکوز پلایا۔ چند لمحوں میں وہ بالکل ہوش میں آگئی۔ ڈھونڈتی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا بچہ کہاں ہے۔"

"بچے کو ڈاکٹر لے گیا ہے۔"

"کیوں لے گیا ہے؟ کہاں لے گیا ہے؟"

"بچہ بہت کمزور تھا' سانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔ اسے آکسیجن دینے کے لئے گئے ہیں۔"

"تم جھوٹے ہو۔ جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو' بتاؤ میرا بچہ کہاں ہے؟ کہاں کر دیا میرے بچے کو؟ ارے میں اس کی ماں ہوں' کم از کم مجھے اس کی صورت تو دکھاؤ۔ لے کر آؤ ایک بار میں اپنا دودھ تو پلاؤں اسے۔ تم نہیں لے کر آرہے ہو تو میں خود جاتی ہوں۔"

وہ جلدی سے اٹھی اور چیخ مار کر ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھ دیئے۔ اس کے ٹانکے ٹوٹ گئے تھے خون بہنے لگا۔ نرس دوڑ کر ڈاکٹر کے پاس گئی اور میں نے حیران و پریشان اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ کمزوری اس پر غالب آتی گئی اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور ہونٹوں سے ٹوٹی پھوٹی آواز نکلتی رہی "میرا بچہ رو رہا۔۔۔ ہوگا۔۔۔۔۔ ایک دفعہ۔۔۔۔۔ دودھ تو۔۔۔۔۔ پلا دوں اسے" اسے اسٹریچر پر ڈال کر جلدی جلدی پھر سے آپریشن تھیٹر کی طرف لے جایا گیا وہ بچ گئی۔

اب دو تین سال گزر گئے ہیں ہوٹل پہلے کی طرح چل رہا ہے۔ زندگی اسی طرح رواں دواں ہے۔ نئے نئے مسافر آتے ہیں اور دو چار دن رہ کر چلے جاتے ہیں' جانے کے بعد کوئی بھی کسی کو یاد نہیں کرتا' نہ کسی کو کسی کے آنے کی خوشی اور نہ جانے کا غم ہوتا ہے۔ ہوٹل کے سب رشتے کچے جھوٹے اور وقتی ہوتے ہیں۔

اب بھی بیروں کو بلانے کے لئے گھنٹی کی آوازیں گونجتی ہیں' اور بیرے روبوٹ کی طرح "جی صاحب" "آیا صاحب" "حاضر صاحب" کہتے دوڑتے بھاگتے سیڑھیاں اترتے اور چڑھتے رہتے ہیں اور رات کو تھک ہار کر چارپائیوں پر جا کر گرتے ہیں۔ صبح سویرے اخبار والے لڑکے کی آواز گونجتی ہے اور شام کو تیل مالش والے لڑکے کی۔ بڑے بڑے سرکاری افسر اور ٹھیکیدار اب بھی آتے ہیں۔ ساری رات پیتے ہیں اور باولے کتوں کی طرح شباب پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

سکالی ہوٹل چھوڑ کر اپنے بنگلے میں رہنے لگا ہے۔ اس کے کمرے میں ایک سادہ دیہاتی رہتا ہے۔ ہر روز آرام کرسی پر بیٹھ دور افق کو گھورنے والا ٹی بی کا نوجوان مریض کبھی کا یہ بے درد دنیا چھوڑ کر افق کے اس پار پہنچ چکا ہے۔ ایک دن اچانک اس کی حالت خراب ہو گئی تھی اور جب اسے اس کے گاؤں لے جانے لگے تو راستے

میں ہی اس کا دم نکل گیا تھا۔ اس کے کمرے میں ایک بہت بڑا دولت مند نوجوان ٹھہرا ہے' کسی مقامی کالج میں پڑھتا ہے اور سارا دن خواہ مخواہ ہی قہقہے لگاتا رہتا ہے۔

ان پرانے مسافروں کو اب کوئی یاد نہیں کرتا ہے۔ کسی کے دل میں بھی ان کی کمی کا کانٹا نہیں چبھتا ہے۔ ہر کوئی اپنے آپ میں ہی گم ہے۔ اپنی مسرتوں کی تلاش میں حیران اور سرگرداں۔ میں اور زہری اسی "۶۶" نمبر کمرے میں رہتے ہیں۔ زندگی نے ہم سے چین اور سکھ چھین کر ہم کو ختم کر دیا ہے اور ہم دونوں اپنے خون میں لت پت تڑپ رہے ہیں۔

زہری نے اب تک اس حقیقت کو قبول نہیں کیا ہے کہ اس کا بچہ مر گیا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ اس کی ساری خوبصورتی اور جوبن کملا گیا ہے۔ اس کے گلاب کے پھولوں جیسا رنگ ماند پڑ گیا ہے۔ اس کی بڑی سیاہ خوبصورت پلکوں والی آنکھوں میں ادھورے خوابوں کی دھول اڑتی رہتی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے بھی ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے ہیں اور دونوں اکیلے بے گانے اور زخموں سے چور چور ہیں۔ وہ اپنے بچے کو یاد کرتے دن گزارتی ہے' کبھی پلاسٹک کے گڈے کو گود میں لٹائے لوریاں دیتے اور کبھی جھولے میں لٹا کے جھولے دیتے گذرتا ہے۔ اسے اس طرح کرتا دیکھ کر میں رو دیتا ہوں۔ اس کے برابر بیٹھ کر اس کے خشک اور الجھے بالوں میں انگلیاں پھیر کر پیار کرتا ہوں اور وہ اپنی اداس ویران خالی خالی آنکھیں اٹھا کر میری طرف یوں دیکھتی ہے' جیسے مجھے پہچانتی ہی نہ ہو' جیسے میں کوئی' پرایا ہوں میں اس کو اپنی طرف اس اجنبیت سے دیکھتا پا کر سوچتا ہوں کیا یہ وہی زہری ہے؟ جس کی آنکھیں خوبصورت' لمبی پلکیں اور قاتل کٹاریاں آنکھیں تھیں اور جس سے اس نے مجھے قتل کیا تھا۔ جن کے ساتھ میں نے خوابوں کا جہان اور محبت کی کائنات آباد کی تھی جس سے میں رات کے اندھیرے اور ستاروں کی روشنی میں بیٹھ کر دل کی باتیں کرتا تھا' اور ہمارا پیار لفظوں کی صورت میں قطرہ قطرہ بن کر ایک دوسرے کے دل کے پیالے میں ٹپکتا تھا۔ کہاں گئے وہ دن' کہاں گئی وہ زہری؟ کس نے ہمارے دل کے پیالے توڑ دیئے۔

کبھی کبھی وہ مجھے پہچانتی ہے۔ میری گود میں سر رکھ کر اپنے بچے کو یاد کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے' جب رو رو کر تھک جاتی ہے' تب دور افق میں دیکھتے ہوئے اس پل کے خواب دیکھتی ہے جب وہ دوبارہ بچے کی ماں بنے گی' ایک دفعہ پھر پوری کائنات سمٹ کر اس کے پہلو میں سما جائے گی اور نئے سرے سے' نئی تخلیق کے لئے انگڑائی لے گی' جب زندگی کے تیسرے تکون کی تکمیل ہوگی اور ہماری روحیں بدن کا بوجھ اتار کر ہلکی پھلکی ہو کر عرش کی طرف اڑیں گی' جب عرش کے ایوانوں کو روشن کیا جائے گا اور حوریں ہمارے بچے کو ستاروں سے ٹکے ہوئے جھولے میں جھلا کر لوریاں دیں گی اور میں اس کی باتیں سن کر رونے لگتا ہوں۔ میں اس کو کس طرح سمجھاؤں کہ اس کا وہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔ وہ پل کبھی اس کی زندگی میں نہیں آئے گا اور وہ کبھی بھی ماں نہیں بن سکے گی۔

امر جلیل

اقبال ان ٹربل

صاف ستھری شلوار قمیض میں ملبوس دو آدمی رام سوامی کے مشہور باکڑا ہوٹل کیفے کنگال میں داخل ہوئے۔ دونوں پچاس پچپن کے لگ بھگ تھے اور خاصے موٹے تھے۔ اس وقت میں ان کا سر نہ دیکھ سکا جو جناح کیپ سے چھپا ہوا تھا۔ باکڑے میں بیٹھے ہوئے گاہک انکی گرانڈیل شخصیت سے بے حد متاثر ہوئے اور گردن گھما کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ دونوں موٹے' ناک کی سیدھ میں چلتے ہوئے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے ہوئے کیفے کنگال کے مالک عاشق آزاد سے باتیں کرنے لگے۔ اس وقت ریکارڈنگ ہو رہی تھی اور چار عدد سپیکروں سے محمد رفیع چیخ رہا تھا۔ "او دنیا کے رکھوالے سن درد بھرے میرے نالے۔" محمد رفیع کی چیخوں میں میں نووارد اور عاشق آزاد کی گفتگو نہ سن سکا۔

کیفے کنگال کا جزک یعنی اصل نام اسٹار آف سندھ ریسٹوران ہے۔ اس باکڑہ ریسٹوران کو ہم لوگ کیفے کنگال کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس باکڑہ میں صرف ایسے لوگ آتے ہیں جن کی تقدیروں کے ستارے ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں اور جن کے ہاتھوں کی لکیریں پھاوڑوں اور کدالوں کی خراشوں سے مٹ جاتی ہیں۔ باکڑہ کے گاہک اپنی پیشانیوں پر صدیوں کی تاریخ کے آثار لے کر چلتے ہیں۔ ان کے ہونٹوں پر انسانیت کی وہ کھوئی ہوئی مسکراہٹ ہوتی ہے جس کی تلاش میں انسان نے فیس پاؤڈر اور گن پاؤڈر تو ایجاد کیا لیکن مسکراہٹوں کی فیکٹری تیار نہ کر سکا۔

کیفے کنگال میں کرسیوں کی بجائے بینچ رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جہاں مجھ جیسے بے آسرا بے در اور بے گھر لوگ آکر بیٹھتے ہیں۔ "کڑک گولی مار" چائے پیتے ہیں اور فلموں کے گانے اور قوالیوں کے ریکارڈ سنتے ہیں۔ کیفے کنگال کا مالک عاشق آزاد صبح سے رات گئے تک لتا منگیشکر' محمد رفیع اور قوالیوں کے ریکارڈ بجاتا ہے اور اس طرح اپنے باکڑہ کی پبلسٹی کرتا ہے۔ چار لاؤڈ سپیکروں سے چیختی چلاتی اور چنگھاڑتی موسیقی کے بے ہنگم شور سے گاہک اپنے وجود کے داخلی شور سے بے خبر ہو جاتے ہیں اور اطمینان سے "کڑک چائے" کی چسکیاں لیتے ہیں۔

کیفے کنگال کے عین سامنے نور مسجد ہے۔ مسجد کے میناروں پر کچھ عرصہ قبل دو لاؤڈ سپیکر نصب تھے لیکن جس روز عاشق آزاد فلم برسات میں محمد رفیع کے گائے ہوئے گانے "میں زندگی میں ہر دم روتا ہی رہا ہوں" کا ریکارڈ لے آیا تب نور مسجد کی انتظامی کمیٹی کا ہنگامی اجلاس بلایا گیا اور مسجد کے میناروں پر مزید دو

لاؤڈ سپیکروں کے نصب کرنے کی اجازت دی گئی۔ تب سے نور مسجد کے میناروں پر چار لاؤڈ سپیکر نصب ہیں۔ جہاں سے دن میں پانچ مرتبہ اذان کی آواز گونجتی ہے اور جمعہ کے روز مولانا عبدالجبار جیکب آبادی نماز سے پہلے ڈیڑھ گھنٹے تک نمازیوں کو قبر کے فشار' قیامت کے عذاب اور خدا کے قہر سے خوفزدہ کرتے ہیں۔ اذان اور مولانا عبدالجبار جیکب آبادی کی تقریر کے دوران عاشق آزاد ریکارڈنگ نہیں کرتا۔ تب کیفے کنگال میں بیٹھے ہوئے گاہک جو بے روزگاری کے عذاب بھوک و افلاس کی اذیت اور خدائی فوجداروں کے قہر سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ مولانا عبدالجبار جیکب آبادی کی تقریر کا بہت گہرا اثر لیتے ہیں اور بے حد متاثر ہوتے ہیں' پھر جیسے ہی مولانا عبدالجبار جیکب آبادی کی تقریر یا اذان کی آواز ختم ہوتی ہے عاشق آزاد ریکارڈنگ شروع کر دیتا ہے۔ "میں زندگی میں ہر دم روتا ہی رہا ہوں"

ایک مرتبہ مولانا عبدالجبار جیکب آبادی کیفے کنگال کے سامنے آکر رک گیا۔ وہ آستین چڑھا کر ہاتھ ہلا ہلا کر پیر زمین پر مار مار کر اور خوب اونچی آواز میں عاشق آزاد سے مخاطب ہوا تھا۔ اتنی جفاکشی کے باوجود لوگ صرف محمد رفیع کی آواز سنتے رہے۔ "میں زندگی میں ہر دم روتا ہی رہا ہوں"

کیفے کنگال سے باہر جب خاصا ہجوم جمع ہو گیا تب آزاد نے ریکارڈنگ بند کر دی اور غور سے مولانا عبدالجبار جیکب آبادی کی باتیں سننے لگا۔ مولانا نے آزاد کو قبر کے فشار' قیامت کے عذاب اور خدا کے قہر سے خوفزدہ کرنے کے بعد کہا۔ "تجھے تو شرم کر عزیزم عاشق علی آزاد ولد معشوق علی برباد۔" (عاشق علی آزاد کے والد معشوق علی شاعر تھے اور برباد ان کا تخلص تھا۔)

عاشق آزاد نے دراز سے ریکارڈنگ کرنے کا لائسنس نکال کر مولانا کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "ہم چندے کا کام نہیں کرتا ہے مولانا۔"

لائسنس کو نظر انداز کرتے ہوئے مولانا عبدالجبار جیکب آبادی نے کہا۔ "تجھے شرم نہیں آتی کہ مومن مسلمان ہوتے ہوئے تو ہندوستانی فلموں کے ریکارڈ یعنی کافروں کی فلموں کے ریکارڈ بجاتا ہے۔ کیا پاکستانی گانے والے مر کھپ گئے ہیں۔ کیا ملکہ ترنم نورجہاں تمغہ خدمت اور جناب مہدی حسن صاحب تمغۂ خدمت رحلت فرما گئے ہیں۔ شرم کر عاشق آزاد۔ تیری قومی غیرت کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا بنگلہ دیش کے سانحے کے بعد بھی تیری آنکھیں نہیں کھلیں۔ دیکھ صرف پاکستانی ریکارڈ بجایا کر۔ جیسا کہ "میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا۔"

مولانا عبدالجبار جیکب آبادی کی تلقین قبر کے فشار اور قیامت کے عذاب کی باتوں کا عاشق نے کوئی اثر نہ لیا۔ وہ اب بھی لتا اور محمد رفیع کے گانے بجاتا ہے۔ آپ کا جب بھی رام سوامی سے گذر ہو گا آپ کیفے کنگال سے محمد رفیع کے چیخ و پکار سنیں گے۔ "او دنیا کے رکھوالے سن درد بھرے میرے نالے۔" عاشق آزاد کی ہٹ دھرمی کا نتیجہ یہ نکلا ہے مولانا عبدالجبار جیکب آبادی اپنی تقریر میں بلند بانگ کہتے ہیں کہ عاشق آزاد دراصل ہندوستان کا سیکرٹ ایجنٹ شری گرمکھداس گورکھا ہے۔ وہ پاکستان کا دیرینہ دشمن ہے اور اپنے

جس وقت دو موٹے اور گران ڈیل شخص کینٹے کنگال میں وارد ہوئے اور عاشق آزاد سے باتیں کرنے لگے تب سب گاہکوں کو تشویش ہوئی اور سب لوگ گردن گھما کر دونوں موٹوں اور عاشق آزاد کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے سمجھا کہ وہ دونوں خدائی فوجدار ہیں اور عاشق آزاد کی کہانی ختم کرنے آئے ہیں۔

وہ دونوں کاؤنٹر پر کہنیاں رکھ کر کھڑے تھے اور بے حد اونچی آواز میں عاشق آزاد سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کا آواز محمد رفیع کا آواز سے اونچی نہ تھی۔ جو گیت جا رہا تھا "میں زندگی میں ہر دم روتا ہی رہا ہوں" وہ دونوں کبھی تو مٹھیاں بھینچ کر اور کبھی کھول کر کبھی آنکھیں پھاڑ کر اور کبھی دانت پیس کر عاشق آزاد سے باتیں کر رہے تھے۔ دور سے یوں لگ رہا تھی جیسے گونگی فلم چل رہی ہو۔

عاشق آزاد کان پر ہاتھ رکھ کر دونوں موٹوں کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب ریکارڈنگ کے شور میں عاشق آزاد ان کی باتیں نہ سن سکا تب اس نے اچانک ریکارڈ اتار دیا۔ محمد رفیع کی چیخ و پکار اچانک رک جانے کے بعد دونوں موٹے اپنی بھدی اور پھٹے ہوئے ڈھول جیسی بلند آواز سن کر خاصے شرمسار ہوئے اور انہوں نے بولنا بند کر دیا اور خاموش ہو گئے۔

ایک موٹے کی ناک پھیلی ہوئی تھی اور اس کی مونچھیں نہیں تھیں۔ دوسرے موٹے کی ناک طوطے کی چونچ کی طرح تھی۔ نوکیلی ناک کے نیچے گھنی مونچھیں تھیں۔ گھنی مونچھوں والے موٹے نے کھانستے ہوئے آزاد سے پوچھا۔ "اقبال کہاں ہے۔"

اپنا نام سن کر میں نے چونک کر دونوں موٹوں کی طرف دیکھا۔

عاشق آزاد نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "سامنے ایک کھڑکی دیکھتے ہو نا۔

اس کھڑکی کے قریب فلم برباد جوانی کی پوسٹر لگا ہوا ہے۔"

"ہاں۔ لگا ہوا ہے۔"

"اس پوسٹر کے قریب ایک چینچر قسم کا موالیوں جیسا شخص بیٹھا ہوا ہے۔"

"ہاں بیٹھا ہوا ہے۔"

"اس کا نام اقبال ہے۔"

دونوں موٹوں نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے میں انسان نہیں بھینسا ہوں اور ساجی شیش محل کو چور چور کر رہا ہوں۔ ان کی مشکوک نگاہیں ان کی تیوریوں کے بل اور اکڑی ہوئی گردن دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ عاشق آزاد کی نہیں بلکہ میری کہانی ختم کرنے آئے ہیں۔

جن دنوں میں پرائمری استاد تھا اور پندرہ اشخاص کے کنبے کا نہ پیٹ پال سکتا تھا اور نہ تن ڈھانک سکتا تھا تب میں نے ارباب اقتدار کو متنبہ کیا تھا کہ فوراً میری تنخواہ بڑھائی جائے ورنہ احتجاج کے طور پر میں اقدام خودکشی سے باز نہیں آؤں گا۔ لیکن پھر بہت جلد مجھے پتہ چل گیا کہ ہمارے معاشرے میں مجھ جیسے لوگوں کے لئے اپنی مرضی کے مطابق نہ صرف زندہ رہنا جرم ہے بلکہ اپنی مرضی کے مطابق مرنا بھی جرم ہے۔ خودکشی کے ارادے کو مشتہر کرنے کے بعد میں خود کو خواہ مخواہ قانون کی زد میں لے آیا تھا۔ زندگی جو پہلے ہی

بوجھ تھی ناقابل برداشت معلوم ہونے لگی اور اس روز جب کیفے کنگال میں دونوں موٹوں کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تب میں سمجھ گیا کہ وہ خدائی فوجدار مجھے زندگی کا مزا چکھانے آرہے ہیں۔ قانون کا کوئی رکھوالا ہم سے یہ نہیں پوچھتا کہ تم کنگلے کس طرح زندگی گذارتے ہو۔ زندہ رہنے کے لئے کیا کیا جتن کرتے ہو۔ زندہ رہنے کے لئے دن میں کتنی مرتبہ مرتے ہو اور پھر مرنے کے بعد کتنی مرتبہ زندہ ہوتے ہو۔ قانون کے رکھوالوں کو ہماری زندگی سے نہیں بلکہ ہماری موت سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ہم اپنی مرضی سے جب مناسب سمجھیں مر جائیں' جب عزت نفس کو تاراج ہوتا دیکھیں تب مر جائیں۔ نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم ذلتوں کے مارے ہوئے لوگ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندہ رہیں لیکن اپنی مرضی کے مطابق مر نہ سکیں۔

میں نے سوچا پچھلی کھڑکی سے کود کر بھاگ جاؤں۔ فرار ہو جاؤں لیکن دوسرے لمحے مجھے یاد آیا کہ ہم عزرائیل سے پیچھا چھڑا سکتے ہیں لیکن اس طرح کی مخلوق سے ہرگز نہیں۔ لہٰذا میں قادر مطلق کی رضا پر راضی ہو کر وہیں بیٹھا رہا اور دونوں موٹوں کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے قدم ملاتے ہوئے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہے تھے۔

قریب پہنچنے کے بعد وہ میرے سامنے ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور غور سے میرا جائزہ لینے لگے۔ مجھے اچھی طرح دیکھنے کے بعد دونوں نے گردن گھما کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور اثبات میں تصدیق کے طور پر اپنے فٹ بال جیسے سروں کو ہلایا۔ جیسے انکا شک یقین میں بدل چکا ہو۔ دونوں موٹوں نے اپنے اپنے سر سے ٹوپی اتر کر میز پر رکھی۔ ان دونوں کے سریکساں طور پر گنجے تھے۔ جس موٹے کی ناک طوطے کی چونچ جیسی تھی اور نوکیلی ناک کے نیچے گھنی مونچھیں تھیں۔ اس موٹے نے میری طرف گھورتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا نام اقبال ہے۔"

"ہاں۔ میرا نام اقبال ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اب میں نے خودکشی کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے اور اب میں خدا کے فضل سے اور میونسپلٹی کی مہربانی سے ریگل سینما کے قریب پکوڑوں کا ٹھیلا لگاتا ہوں اور آج کل مزے سے زندگی گذار رہا ہوں۔"

وہ دونوں خاموش رہے اور میری جانب دیکھتے رہے ان کی نگاہوں کو میں نے اپنے جسم میں چبھتے ہوئے محسوس کیا میری بے چینی بڑھنے لگی۔ میں نے کہا۔ "یقین کیجئے میں نے سچ مچ مرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ بلکہ اس ارادے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منسوخ کر دیا ہے۔ میں قانون کی خلاف ورزی کرنا نہیں چاہتا اور پھر زندہ رہنے میں کتنا مزہ ہے' کتنا لطف ہے اور پھر جب ہم بہت عرصے تک زندہ رہتے ہیں تب ہم ہنسنا بھی سیکھ لیتے ہیں۔ زیادہ عرصے تک زندہ رہنے کے لئے میں نے سکول میں پڑھانا ترک کر دیا ہے۔ اب میں ریگل سینما کے قریب پکوڑے بیچتا ہوں۔ خوش ہوں۔ میں ہنس سکتا ہوں۔ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو بھی ہنس کر دکھا سکتا ہو۔"

پھر بھی وہ دونوں خاموش رہے میری طرف دیکھتے رہے۔ ان کی خاموشی سے میں پریشان ہونے لگا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے کہا۔ "آپ لوگ دل میں سوچتے ہونگے کہ بھلا ڈبل گریجویٹ بھی کہیں پکوڑے بیچتے

ہیں۔ وہ جیک کے سارے افسر بن جاتے ہیں اور ساڑھے سات کروڑ عوام پر حکومت کرتے ہیں۔ میرے پاس جیک نہ تھا۔ ایک شخص نے مجھے سو روپے کا چیک دیا اور اپنا ایم اے کا سرٹیفکیٹ میں نے اس کے ہاتھوں بیچ دیا۔ اس کے پاس جیک تھا۔ وہ ایک جگہ بہت بڑا افسر لگا ہوا ہے۔ غالباً آپ کے محکمے میں۔"

پھر بھی وہ دونوں خاموش رہے۔ان کے چہرے زیادہ مکروہ اور کرخت ہوتے گئے۔ مجھے گھٹن محسوس ہونے لگی۔ میرے قریب ہی رمضانی بیٹھا ہوا تھا۔ کڑک چائے پی رہا تھا۔ رمضانی ایک اطلاع کے مطابق رمضان کے مہینے میں پیدا ہوا تھا۔ اس لیے والدین نے اس کا نام محمد رمضان رکھ دیا لوگ اسے رمضانی کہا کرتے ہیں۔ رمضانی نے میرے حال پر رحم کھاتے ہوئے موٹوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ہاں صاحبو! اقبال جب پرائمری ماسٹر تھا تب فاقے کرتا تھا اور ایک روز فاقوں سے تنگ آکر اس نے خود کشی کا ارادہ کیا تھا پکا کہیں کا۔"

دونوں موٹوں نے اپنے گنجے سر گھما کر رمضانی کی طرف دیکھا اور اپنی چبھتی ہوئی نگاہیں رمضانی کے چہرے پر گاڑ دیں۔ رمضانی نے کہا۔ "اقبال جب سے پڑھانے کا پیشہ ترک کر کے پکوڑے بیچنے لگا ہے تب سے خوشحال زندگی گذار رہا ہے۔ اس نے خود کشی کا ارادہ دل سے نکال دیا ہے۔"

دونوں موٹوں کی آنکھیں عقاب کی آنکھوں کی طرح گول ہو گئیں۔ وہ خاموش رہے۔ وہ رمضانی کی طرف دیکھتے رہے۔ رمضانی کی حالت غیر ہو گئی۔ اس نے کہا۔ "صاحبو! میرا نام رمضانی ہے۔ میں ریگل سینما کے قریب گنڈیریوں کا ٹھیلا لگاتا ہوں۔"

"خاموش! " دونوں موٹوں نے ڈوئیٹ میں چلا کر کہا۔ "خاموش۔"

رمضانی خوف کے مارے سوالیہ نشان کی طرح کبڑا ہو گیا۔ جس موٹے کی ناک پچکی ہوئی تھی۔ اس نے رمضانی سے کہا۔ "گیٹ آؤٹ۔"

رمضانی کی انگریزی زبان کی شدبد قومی و صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں سے زیادہ نہیں۔ پھر بھی وہ لہجے کی کرختگی سے جملے کا مفہوم سمجھ گیا اور کیفے کنگال سے کھسک گیا۔ رمضانی کی حالت دیکھ کر دوسرے گاہک بھی کیفے کنگال سے جانے لگے۔

رمضانی کے چلے جانے کے بعد دونوں موٹوں نے اپنی نگاہیں پھر سے مجھ پر مرکوز کر دیں۔ میں نے گھبرا کر ایلومینیم کے میلے کچیلے اور پچکے ہوئے جگ سے ایلومینیم کے ایک گلاس میں پانی انڈیلا اور ایک سانس میں پی گیا۔ پانی پینے کے بعد گلاس میز پر رکھا اور پھر نظریں جھکا کر انگلی سے میز کا میل کھرچنے لگا۔

ایک موٹے نے کھانستے ہوئے اپنا گلا صاف کیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ موٹا اپنی مونچھوں کے ساتھ بالکل مگرمچھ سے مشابہ تھا۔ اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ "کب سے شاعری کر رہے ہو۔"

"شاعری!" میں چونک پڑا۔

"ہاں۔" موٹے مگرمچھ نے پوچھا۔ "کب سے شاعری کر رہے ہو۔"

میں نے کہا۔ "جب میں اور میرے کنبے کے لوگ فاقے کرتے تھے اور دوا کے بغیر درد میں تڑپتے

تھے اس وقت مجھے خود کشی کرنے کا خیال تو آیا تھا لیکن شاعری کرنے کا خیال نہیں آیا۔"

مگرمچھ نے اپنے کلین شیو ساتھی کی طرف دیکھا۔ جو اچانک مجھے موٹے مینڈک کی طرح نظر آنے لگا۔ مگرمچھ نے موٹے مینڈک سے انگریزی میں کہا۔ "بہت چالاک ہے۔"

مونچھوں والے مگرمچھ نما موٹے نے مجھ سے کہا۔ "تو تم انکار کرتے ہو کہ تم شاعر ہو۔"

"میں سالم دماغ کا آدمی ہوں صاحبو!" میں نے کہا۔ "شاعروں اور افسانہ نگاروں کے دماغ میں خلل ہوتا ہے جس کے باعث وہ شاعری کرتے ہیں۔ افسانے لکھتے ہیں۔ میں خدا کے فضل سے ٹھیک ٹھاک ہوں اور رینگل سینما کے قریب پکوڑے بیچتا ہوں۔"

موٹے مینڈک نے کہا۔ "یاد رکھو کہ ہم تمہارا ایک ایک جواب نوٹ کر رہے ہیں۔"

موٹے مگرمچھ نے پوچھا۔ "کیا تم شاعر نہیں ہو۔"

میں نے کہا۔ "نہ میں شاعر ہوں اور نہ میرا باپ شاعر تھا۔"

مگرمچھ نے کہا۔ "ہمیں ہنسنے کی عادت نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں ہنسانے کی سعی نہ کرو۔"

میں نے کہا۔ "میں پچھلے ایک کروڑ سال سے ہنسی کو ترس رہا ہوں۔ میں بھلا دوسروں کو کیا ہنساؤں گا۔"

موٹے مینڈک نے کہا۔ "تم نے غالباً ہمیں پہچانا نہیں ہے۔"

"آپکے سوالوں سے بخوبی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ آپ کس محکمے سے تعلق رکھتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ میری کہانی ختم کرنے آئے ہیں۔"

دونوں موٹوں کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ مگرمچھ نے کہا۔ "پھر تم شاعری کیوں کرتے ہو۔"

میں نے کہا "میں شاعر نہیں ہوں۔"

موٹے مینڈک نے کہا۔ "تم نہ صرف شاعر ہو بلکہ ایک انقلابی شاعر ہو۔"

"انقلابی شاعر!" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔" مینڈک نے کہا۔ "تم ایک انقلابی شاعر ہو۔"

مگرمچھ نے کہا۔ "اور آجکل تم خطرناک قسم کی سمبالک یعنی علامتی شاعری کر رہے ہو۔"

انقلاب' علامت اور شاعری کی باتیں سنکر دو چار گاہک جو کیفے کنگال میں رہ گئے تھے بھاگ کھڑے ہوئے۔

میں نے دونوں موٹوں سے کہا۔ "آپ اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔ میں شاعر وغیرہ نہیں ہوں۔"

مگرمچھ نے پوچھا "کیا تمہارا نام اقبال نہیں ہے۔"

"ہاں۔ میرا نام اقبال ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس میں قصور میرے والدین کا ہے میرا نہیں۔"

موٹے مینڈک نے پوچھا۔ "مُل کے بارے میں کیا جانتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔"
دونوں موٹوں نے چلا کر کہا "پکڑے گئے بچو!"
"کیا پکڑے گئے!" میں نے پوچھا۔
موٹے مگرمچھ نے پوچھا "کیا یہ شعر تمہارا نہیں ہے۔"
میں نے کہا۔ "یہ شعر علامہ اقبال کا ہے اور میں اقبال پکوڑے والا ہوں۔"
"کون علامہ اقبال!" مینڈک نے کہا۔ "ہم صرف ایک اقبال کو جانتے ہیں اور وہ اقبال تم ہو۔"
مگرمچھ نے پوچھا۔ "پاکستان کو وجود میں آئے کتنے برس ہوئے ہیں۔"
میں نے کہا۔ "تیس برس۔"
مینڈک نے پوچھا۔ "تم اب تک گذرے ہوئے کس زمانے کو یاد کرتے ہو۔ ہندوؤں کے زمانے کو یا انگریزوں کے زمانے کو!"
میں نے سر پکڑتے ہوئے کہا۔ "آپکی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔"
"ہماری باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آتیں!" موٹے مگرمچھ نے کہا۔ "اس سلسلے میں اپنے الفاظ سنو گے!"
"میرے الفاظ!" میں نے چونک کر پوچھا۔
"ہاں تمہارے اپنے الفاظ۔ تمہاری شاعری۔" مینڈک نے کہا۔ "تم نے اپنے اشعار میں ایک دفعہ کہا تھا۔

آتا ہے یاد مجھکو گذرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

میں نے کہا۔ "یہ اشعار علامہ اقبال کے ہیں۔ میرے نہیں ہیں اور یہ اشعار علامہ اقبال نے آج سے پچاس برس پہلے کہے تھے۔"
"کیوں جھوٹ بولتے ہو۔" موٹے مینڈک نے کہا۔ "یہ اشعار تمہارے ہیں تم نے حال ہی میں کہے ہیں۔"
میں نے سوچا ان سے بحث بیکار ہے۔ میں خاموش ہو گیا۔
موٹے مگرمچھ نے پوچھا۔ "نماز پڑھتے ہو۔"
میں نے کہا۔ "یہ میرا اور میرے مولا کے بیچ کا معاملہ ہے۔"
"کیا ان ہی خیالات کا اظہار تم نے اپنی شاعری میں نہیں کیا ہے۔" موٹے مینڈک نے کہا "تم نے کہا ہے۔

تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں"

"لیکن میں اقبال......"

"خاموش۔ تم اس بات کی تردید نہیں کر سکتے کہ تم اقبال ہو۔"

"اور تم نے ہی تو کہا ہے۔

ایسی نماز سے گذر ایسے امام سے گذر۔"

"مناسب ہے کہ میں خاموش رہوں۔" میں نے کہا۔ "یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زبان میری۔"

"یہ کس کا شعر ہے۔" موٹے مگرمچھ نے پوچھا۔ "کیا یہ شعر تمہارا نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ شعر علامہ اقبال کا ہے۔"

"کون علامہ اقبال!" موٹے مینڈک نے کہا۔ "ہمیں جھانسے دے رہے ہو۔"

میں نے دل میں سوچا بیٹے برے پھنسے ہو۔ تمہارا اقبال بلند ہونے کی بجائے غروب ہونے کو ہے۔ یہ ماں باپ نہ جانے کیوں ہمارا نام اقبال رکھتے ہیں۔ عبدالودود' اللہ دتا' چراغ دین قسم کا نام بھی رکھا جا سکتا ہے۔ میرا نام اگر فقیر محمد ہوتا تو مگرمچھ اور مینڈک کے استفسار کا شکار نہ ہوتا۔

مگرمچھ نے پوچھا۔ "اس بے ہودہ قسم کے رستوران میں کیوں آتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "اس لئے کہ پاکستان کی واضح اکثریت صرف ایسے ہی ریسٹوران میں جانے کی بساط رکھتی ہے۔"

"کیا یہاں مزدور نہیں آتے۔"

"آتے ہیں۔"

"کیا یہاں کسان نہیں آتے۔"

"آتے ہیں۔"

"کیا یہاں بیروزگار نہیں آتے۔"

"آتے ہیں۔"

"کیا تم ان کے بارے میں سوچتے ہو؟"

"ہاں سوچتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں ان کے لئے لگاتار سوچتا ہوں۔ وہ مجھ سے ہیں۔ میں ان سے ہوں۔"

موٹے مگرمچھ نے کہا۔ "اور غالباً اسی لئے تم نے ایک روز کہا تھا۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو"

میں نے حواس باختہ ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

مینڈک نے کہا۔ "اسی نظم میں تم نے کسانوں کو بغاوت پر اکساتے ہوئے کہا ہے۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو"

مگرمچھ نے کہا۔ "ہم وثوق سے جانتے ہیں کہ تم سوشلسٹ ہو بلکہ کمیونسٹ ہو اور حال ہی میں روس کی یاترا سے واپس آئے ہو۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔" میں حال ہی میں روس سے آیا ہوں۔"

"ہاں۔ تم حال ہی میں روس سے ہو کر آئے ہو۔" مینڈک نے کہا۔ "اور روس سے آنے کے بعد تم نے کہا ہے۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمی رفتار"

"دیکھئے آپ دونوں بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ تمام اشعار علامہ اقبال کے ہیں۔ میں اقبال ضرور ہوں لیکن میں اقبال پکوڑے والا ہوں۔ کچھ لوگ اقبال پسند ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اقبال سنگھ ہوتے ہیں۔ آپ ان سب سے استفسار نہیں کر سکتے۔"

"ملک کا امن و امان خطرے میں ڈال دیا ہے تم نے۔" مگرمچھ نے کہا۔ "تم تباہی چاہتے ہو۔ تم بربادی چاہتے ہو۔ تم نے کہا ہے۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات"

کیفے کنگال کا ماحول میری نگاہوں میں گردش کرنے لگا میں نے سر تھام لیا۔ موٹے مینڈک نے اپنا گنجا سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "اور تمہاری یہ مجال کہ تم سرکار کا مذاق اڑاتے ہو۔"

"میں!" میں نے بے بسی کے عالم میں پوچھا۔

"ہاں تم۔" مینڈک نے کہا۔ "کیا تم نے اپنے اشعار میں ایک جگہ یہ نہیں کہا کہ۔

مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا
کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا

مگرمچھ نے کہا۔ "کیا ان نازک حالات میں تمہیں یہ زیب دیتا ہے کہ کہتے پھرو کہ۔

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضا مند
تاویل مسائل کو بنا دیتے ہیں بہانہ"

میرا سر چکرانے لگا۔

مینڈک نے کہا۔ "عوام جب جمہوریت کے لئے دعا گو ہیں کیا یہ قابل اعتراض نہیں ہے کہ تم کہتے

ہو پھرو کہ۔

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہ افلاک"

مگرمچھ نے کہا۔ "تم فاشی ہو اس لئے تم نے جمہوریت کا مذاق اڑایا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں اقبال پکوڑے والا ہوں۔ خدا کی قسم میں اقبال پکوڑے والا ہوں۔"

"ارے بابا میں سیاست دان وغیرہ نہیں ہوں۔"

مینڈک نما موٹے نے کہا۔ "چلو ایک مرتبہ پھر ہم ثابت کرتے ہیں کہ تم ہی وہ اقبال ہو جس کی ہمیں تلاش ہے۔"

مگرمچھ نے پوچھا "غالب کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہ عظیم شاعر ہے۔"

پوچھا "اس کی عظمت میں کسی کی ہمسری قبول نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "نہیں۔"

"بہت برے پھنسے ہو بیٹے۔" موٹے مینڈک نے کہا۔ "تم نے ان ہی خیالات کا اظہار اپنے اشعار میں ایک جگہ اس طرح کیا ہے کہ۔

لطف گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں"

ان کی باتیں دلیل اور منطق سننے کے بعد میں بھی محسوس کرنے لگا کہ میں اقبال پکوڑے والا نہیں بلکہ علامہ اقبال ہوں۔

مگرمچھ نے پوچھا۔ "آخری مرتبہ تم اجمل خٹک سے کب ملے تھے۔"

میں تعجب سے پوچھا۔ "میں اجمل خٹک سے پہلی مرتبہ کب ملا تھا۔"

مگرمچھ نے کہا۔ "جب تم نے کہا تھا۔

اپنی خودی پہچان او غافل افغان"

مینڈک نے کہا۔ "اور آخری مرتبہ جب تم اجمل خٹک سے ملے تھے تب تم نے کہا تھا۔

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم
کہ ہو نام افغانیوں کا بلند"

میں نے پوچھا۔ "کیا آپ لوگ مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔"

"فی الحال نہیں۔" موٹے مینڈک نے کہا۔ "لیکن مزید استفسار کے لئے ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔"

"میں چلنے کے لئے تیار ہوں۔" بینچ سے اٹھتے ہوئے میں نے کہا۔

"اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز

ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو"

دونوں مونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا مونے گمرمچھ نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ یہ وہی اقبال ہے جسکی ہمیں تلاش ہے۔"

اور پھر وہ دونوں مزید استفسار کے لئے مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔

انیس انصاری

نواب کے لئے وہ پہلا موقع تھا۔ جب اس نے اپنی یتیم پوتی کو خالی پیٹ سونے دیا تھا۔ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ بخار نے اس کو اتنا کمزور اور لاغر کر دیا تھا کہ وہ پانچ دن تک جھوپڑی سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔ اس کی جمع شدہ پونجی ان پانچ دنوں میں ختم ہو چکی تھی' کچھ کھانے پر اور کچھ دواؤں پر۔ بڑھاپے اور دمے کی بیماری کی وجہ سے وہ زیادہ چل بھی نہیں سکتا تھا۔ بھیک مانگنے جاتا تھا تو دو تین گلیوں کے پھیروں میں ہی اسے اتنا مل جاتا جو تین وقت پیٹ بھرنے کے لئے کافی ہوتا۔ جمعہ کے دن جامع مسجد اور عید گاہ کے باہر کھڑا ہوتا۔ اللہ کے نام پر کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ وہ سوچتا پہلے والے دن تو ہیں نہیں۔ اب لوگوں کے دل کالے ہو گئے ہیں۔ پہلے اگر کچھ نہیں دیتے تھے تو دکھ بھی نہیں دیتے تھے اور اب۔۔۔۔ قصور ان کا بھی نہیں۔ گردن توڑ مہنگائی ہے۔ لوگ دیں تو دیں کہاں سے؟ دینے والے ہاتھ کم ہیں اور لینے والوں کا حساب ہی نہیں اس کے باوجود نواب کا ایک ہی پھیرے میں گزر بسر ہو جایا کرتا تھا۔

زینت پیدا ہوئی تو چوتھے دن اس کی ماں مر گئی۔ باپ نے بھی نبھا نہیں کیا۔ چھ مہینے کے بعد یتیم کر کے چلا گیا۔

نواب' بیٹے اور بہو کی موت کا درد اندر چھپا کر پوتی کی پرورش میں لگ گیا۔ اب وہ آٹھ برس کی ہو گئی تھی۔ نواب نہ تو اسے اپنے ساتھ بھیک مانگنے لے جاتا' نہ ہی اسے اکیلا جانے دیتا تھا۔ کہتا تھا "جب تک زندہ ہوں تب تک بیٹھی عیش کیا کرے۔ مر گیا تو جو اس کی قسمت۔ فقیر کے لیے بھیک میں ملا کھانا عیش نہیں ہے تو کیا ہے؟"

چھٹے دن نواب کا بخار ٹوٹا۔ بدن کا درد بھی کم ہو گیا اور کھانسی میں بھی کافی کمی آگئی تھی۔ تین دن سے صرف چائے پر گزر تھا۔ آج بھوک محسوس کی تو گھر میں صرف اللہ کا نام تھا۔ خود تو وہ یہ دن اسی طرح گزار دیتا مگر اس کی پوتی رات سے فاقہ پر تھی۔ اٹھا تو چکر آگیا۔ ایک تو بخار کی کمزوری دوسرا خالی پیٹ۔ قدم اٹھیں تو کس طرح؟ کراہتا ہوا جیسے تیسے اٹھا۔ دو تین قدم چلا تو آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہیں رک گیا۔ سانس درست کر کے ڈنڈا اٹھایا۔ اس کے سہارے چلتے ہوئے جا کر کشکول سنبھالا اور آہستہ آہستہ جھوپڑی سے باہر نکل آیا۔ دروازے کے پاس گر پڑتا مگر دروازے کو پکڑ کر سنبھلا۔ زینت نے دادا کو اس حال میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ قریب آ کے بولی۔ "بابا ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں' تم آرام کرو آج

میں جاتی ہو۔" نواب نے گیلی آنکھوں سے زینت کو دیکھا اور کہنے لگا۔ "زینت بیٹا سمجھتا ہوں کہ اب قہر بنا رہی ہے۔ مگر جب تک سانس چل رہی ہے تب تک تمہیں بھیک مانگنے نہیں بھیجونگا۔" دو قدم آگے بڑھا پھر رک گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا تھا۔ زینت نے دوڑ کر ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی۔ "بابا تم تو چل بھی نہیں سکتے۔ چلو اندر بیٹھو میں جاکر ماسی سبھاگی سے آٹا لیکر آتی ہوں۔"

"نہ بیٹا نہ۔" نواب کہنے لگا۔ "پہلے بھی دو دفع اس نے آٹا دیا ہے۔ ہر گھر میں تنگی ہے۔ میں آہستہ آہستہ جاتا ہوں بھیک مانگنے۔ جلدی واپس آجاؤں گا۔"

زینت سے رہا نہیں گیا۔ کہنے لگی۔ "بابا تمہرو میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔" دادا کو کچھ کہنے نہیں دیا۔ دوڑ کر جھونپڑے سے دوپٹہ اٹھا لائی اور ہاتھ پکڑ کر اس کے ساتھ چلنے لگی۔

کچھ ڈنڈے کا سارا کچھ زینت کا سارا نواب اب کچھ چلنے کے قابل ہو گیا تھا۔

سردی کے دن تھے۔ سورج نے ابھی آنکھ کھولی ہی تھی۔ گھروں کے دروازے ابھی بند تھے۔ کہیں کوئی اکا دکا آدمی نظر آتا' پھر وہی سناٹا۔ دو گلیاں گھومے مگر نہ روٹی کا ٹکڑا ملا' نہ پیسے۔ تیسری گلی میں پہنچے تو نواب کو کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ کھانستے کھانستے ایک دروازے کے پاس بیٹھ گیا' کیونکہ اسے محسوس ہوا تھا کہ اب وہ آگے نہیں چل سکے گا۔ ابھی دو منٹ ہی گذرے تھے کہ دروازہ کھلا اور کسی نے روکھے لہجے میں پوچھا۔ "ارے کون ہو؟" نواب نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔

"سائیں بیمار ہوں۔ سانس ٹھیک کرنے کے لئے بیٹھا ہوں۔ چلا جاؤں گا۔"

"چلو بابا یہاں سے چلو۔ کسی دوسرے دروازے پہ جاکر سانس درست کرو۔"

"جاتا ہوں سائیں۔"

نواب یہ کہہ کر ڈنڈے کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ زینت نے ہاتھ پکڑا۔ زینت کے لیے یہ تجربہ نیا تھا۔ اس نے سمجھا تھا کہ بھیک مانگنا بہت آسان کام ہے۔ مگر جب اپنے کانوں سے جھڑکیاں سنیں تو پتہ چلا کہ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا کتنا مشکل کام ہے۔ اس کو اب احساس ہو کہ ایک ایک نوالہ جو اب تک کھاتی رہی ہے' کتنا مہنگا تھا۔ کھانستا اور ہانپتا نواب بازار کی طرف چل پڑا۔ وہاں اس کی ٹانگیں اور سارا جسم کانپنے لگے۔ زینت نے سارا دیکر ایک دوکان کے پاس جا کر بٹھایا اور کہا۔ "بابا یہاں بیٹھو میں بھیک مانگ کر آتی ہوں۔" نواب کو اتنی کمزوری محسوس ہونے لگی تھی کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی زینت کو جانے سے نہ روک سکا۔ بیٹھتے ہی نواب کی کھانسی پھر ابھر آئی۔ ابھی کھانس ہی رہا تھا کہ دوکاندار نے بازو سے پکڑا اور کھینچ کر اٹھایا اور کہنے لگا۔ "ارے بوڑھے مرنا ہے تو کسی دوسری دوکان کے پاس جا کر مرو۔۔۔ دوکان ابھی کھولی بھی نہیں ہے کہ یہ منحوس سامنے آگیا ہے۔" نواب اٹھ کر اس طرف جانے لگا۔ جس طرف زینت گئی تھی۔ دو قدم اٹھائے تھے کہ سر چکرانے لگا۔ ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی کہ شاید کہیں بیٹھنے کے لئے جگہ مل جائے' مگر جس طرف بھی دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ ہر ایک اس کو ہاتھ سے اشارہ کر رہا ہو کہ یہاں مت بیٹھو اس کے دماغ میں یہ الفاظ ہتھوڑے کی طرح لگ رہے تھے۔ "ارے مرنا ہے' تو کسی دوسری دوکان پر جا

کر مرو۔" آوازوں سے جان چھڑانے کے لیے آگے قدم بڑھاتا رہا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ نہ دیکھ سکتا تھا' نہ سن سکتا تھا۔ اس کو بس ایک ہی احساس تھا کہ زینت اس طرف گئی ہے اور اسے اسی طرف جانا چاہیے۔ وہ اس طرف بڑھتا گیا۔

زینت کو ایک نانبائی نے رحم کھا کر رات کی بچی ہوئی روٹی کے ٹکڑے دے دیے۔ زینت کو پتہ نہیں جیسے کیا مل گیا۔ روٹی کے ٹکڑے دوپٹے کے پلو میں لپیٹ کر خوشی خوشی دادا کی طرف واپس جانے لگی۔ راستے میں لوگوں کا ہجوم دیکھا تو سوچا کہ کوئی بازیگر ہو گا۔ دل چاہا جا کر دیکھے مگر وہ اپنے دادا کو دکھانا چاہ رہی تھی کہ اسے کتنی ساری روٹی مل گئی ہے۔ سوچا کہ دادا سے کہوں گی کہ بابا اب تم بھیک مانگنے نہ جایا کرو۔ میں مانگ کر لاؤں گی۔ مجھے بھیک مانگنا آگیا ہے۔

زینت جب دوکان کے پاس پہنچی تو دادا کو وہاں نہیں پایا' جہاں اسے چھوڑ کر گئی تھی۔ وہاں صرف تھوک اور بلغم پڑا ہوا تھا۔ ادھر ادھر دیکھا مگر دادا نظر نہیں آیا۔ ایک راہ گیر سے پوچھا۔

"کاکا میرا بابا یہاں بیٹھا تھا۔ کہاں گیا؟"

"جہنم میں!؟"

جہنم کیا ہے؟ وہ سوچنے لگی۔

زینت انہیں قدموں سے واپس ہوئی۔ ایک دوکان کے سامنے لوگوں کا ہجوم دکھائی دیا۔ سوچا کہ شاید دادا بھی اس ہجوم میں ہو۔ قریب پہنچی تو دیکھا کہ اس کے دادا کا ڈنڈا ہجوم کے باہر ٹوٹا پڑا ہے۔ لوگوں کے بیچ سے جگہ بناتی ہجوم کے اندر جا پہنچی' تو کیا دیکھتی ہے کہ دادا زمین پر چت پڑا ہے اور اس کے چاروں طرف خون بکھرا ہوا ہے۔ دوپٹے کا پلو اس کے چھوٹے سے ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور باسی روٹی کے ٹکڑے اس کے دادا کے خون میں جا پڑے۔

زینت نے سوچا شاید یہی جہنم ہے۔

اس نے پوری قوت سے چیخ ماری اور بابا کہہ کے دادا کی کچلی ہوئی لاش پر گر گئی۔

بیگم زینت عبداللہ چنا

من اجلا تن اجلا

"شانا" "شائل" "شانی"

میں نے زور سے پکارا۔

"او ادی شائل"

میرے سامنے پڑے ہوئے ہڈیوں کے پنجر میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور نہ ختم ہونے والی کھانسی شروع ہو گئی۔ میں نے اس کی چھاتی سہلانا شروع کر دی۔ وہ کھانس کھانس کر ادھموئی ہو گئی تھی۔ میں نے آہستہ سے اسے سیدھا کیا۔ اس کے گلے سے خر خر کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور دیکھتی رہی۔ میری آنکھوں کے سامنے پردہ سا آگیا۔ شفاف سا پردہ جس پر مجھے سفید دودھ جیسا چہرہ نظر آنے لگا تھا۔

میں نے مسکراتے ہونٹوں کو دیکھا۔ ان کے پیچھے جھانکتے ہوئے موتی جیسے دانت دیکھے میں نے سروقد مجسمے کو محسوس کیا۔ بڑے بڑے بالوں والی نازنین کو دیکھا۔ کیا ناز و انداز تھے اس کے چلنے میں۔ اس کی باتوں میں کتنا رس تھا۔ میں نے آنکھیں جھپک کر غور سے دیکھا۔ حسن و جمال کے اس مجسمے میں کتنی نخوت، کتنا تکبر اور غرور تھا۔ مجھے یاد کے پردے پر ماضی کے نقش دکھائی دے رہے تھے۔

شانا میری کالج فیلو تھی۔ میں نے اسے کالج میں جب پہلی بار دیکھا تو دیکھتے ہی میں ساکت ہو گئی تھی۔ قدرت نے اسے بے انتہا حسن سے نواز تھا۔ اس کی چال میں اتنا وقار تھا کہ نگاہ ہٹانا آسان نہیں تھا۔ سارا کالج اس کا گرویدہ تھا لیکن اس حسن و جمال کے احساس نے اسے مغرور بنا دیا تھا۔ غرور اس کے لئے مور کے پاؤں کی طرح بدزیب بن گیا۔ عجب رنگا رنگی ہے۔ خوبصورتی اور حسن کا بے بنیاد غرور لوگوں کو دکھی کر دیتا تھا۔ اس کی میٹھی اور اچھی آواز میں تکبر کی کڑواہٹ شامل ہوتی تھی۔ جھڑک دینا تیز آواز میں بات کرنا اس کی عادت تھی۔ جب بھی اسے کوئی بات اچھی نہیں لگتی تو اس طرح ناک بھوں چڑھا لیتی کہ اس کا معصوم چہرہ بدصورت ہو جاتا تھا۔ اس کے بے پناہ حسن کے ساتھ ساتھ اس کا غرور اور تکبر بھی بہت مشہور تھا۔ پڑھائی میں دوسروں سے کم تر ہونے کے باوجود وہ کلاس مانیٹر تھی۔ اس کا معصوم چہرہ سب کو موہ لیتا تھا۔ وہ جب میرے قریب سے گزرتی تو نخوت سے منہ پھیر لیا کرتی تھی کیونکہ میں ایک تو نئی تھی، دوسرے میری صورت شکل بھی کوئی خاص نہیں تھی۔ اس کے اس طرز عمل پر اکثر مجھے ہنسی آجاتی تھی۔

ایک دن میں میس سے کھانا کھا کر نکل رہی تھی تو وہ میرے سامنے سے تیزی سے نکل کر جانے

گی۔ میں نے جلدی سے اس کے بازو کو پکڑ لیا۔ اس وقت میرے اندر جانے کہاں سے ہمت آ گئی تھی۔
"ادی آخر میں نے کیا قصور کیا ہے کہ تم میرے سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتیں؟"
اس نے میرا ہاتھ جھٹک کر اپنا بازو چھڑا لیا۔
"اے لڑکی تم جو نیر ہو۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے اپنی حیثیت کا خیال رکھا کرو۔ جاؤ اپنی حیثیت کی لڑکیوں سے دوستی کرو۔ میرے پیچھے تو لڑکیاں مکھیوں کی طرح لگ گئی ہیں۔ واہ جی مینڈکی کو بھی زکام ہو گیا ہے۔"

دکھ اور بے عزتی سے میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں وہیں تھم گئی۔ وہ آگے نکل گئی۔ کافی دیر میں اسی طرح کھڑی رہی۔ میری کلاس فیلو نسیم نے آکر چونکا دیا تو میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"ادی یہ تو بتاؤ کیا دنیا میں خوبصورتی ہی سب کچھ ہے۔" نسیم بے چاری تو پھر مجھ سے بھی شکل و صورت میں کم تھی مگر اس کے جواب سے مجھے اطمینان ہوا۔
"نہیں ادی خوبصورتی ہی اگر سب کچھ ہوتی تو خدا خراب شکلوں والے انسان پیدا ہی نہ کرتا۔ حسن تو انسان کے اندر ہونا چاہیے۔ تم نے سنا نہیں ہے کہ خوبصورت بیل اگر کڑوی ہو تو اس کی خوبصورتی کڑواہٹ تو ختم نہیں کر سکتی۔ دل کی خوبصورتی کے آگے تو ہر چیز کم تر ہے۔"
میں جو شکل و شباہت کے چکر میں احساس کمتری کا شکار ہو چکی تھی۔ میں اس دن سے دل کی خوبصورتی کی طرف دھیان دینے لگی تو مجھے اپنا تن اس سے بھی زیادہ اجلا نظر آیا۔ میں نے شائل کو اہم سمجھنا چھوڑ دیا اور اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لی۔ رفتہ رفتہ میری کلاس میں عزت بڑھتی گئی۔ میری ذہانت کے سب قائل ہو گئے۔ میری شہرت اور عزت کی وجہ سے شائل حسد میں مبتلا ہو گئی ہر جگہ مجھے نیچا دکھانے کے لیے میرا مذاق اڑاتی' نقلیں اتارتی' تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ یہاں تک کہ پرنسپل سے شکایتیں بھی کرنے لگی مگر قدرت ہمیشہ میری مدد کرتی۔ سالانہ امتحانات ہوئے میں پہلے نمبر پر رہی اور شائل فیل ہو گئی۔ میں اگلی جماعت میں چلی گئی جبکہ وہ اسی کلاس میں رہ گئی۔ وہ اس دن کمرہ بند کر کے سارا دن روتی رہی شام کو جب باہر آئی تو اس کے سوگوار حسن نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں نے اسے بڑی گرمجوشی سے گلے لگا کر میٹھی آواز میں کہا۔
"شائل دکھ نہ کرو۔ محنت کر کے دیکھو تو۔۔۔"
میں نے ابھی اتنا ہی کیا تھا کہ اس نے مجھے پوری قوت سے دھکا دیا کہ میں دروازے کی دہلیز سے ٹکرا کر گر پڑی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میرے کانوں میں اس کی آواز آئی۔
"بڑی آئی مجھ سے ہمدردی کرنے۔ ارے میں تم جیسوں سے بات بھی کرنا پسند نہیں کرتی۔"
"میں۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ میں۔۔۔۔"
وہ میں۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ میرے کانوں میں بھرتی رہی مگر میں نے کبھی اپنے "میں" ہونے کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ شائل مزید پڑھائی جاری نہ رکھ سکی جلد ہی کالج چھوڑ کر چلی گئی اور اس کے گھر والوں نے ایک

امیر زادے کے ساتھ جو نشے کی لت میں پھنسا ہوا تھا' اس کی شادی کرا دی۔ یہ خبر مجھے نسیم نے بتائی تھی۔
میں امتحان پاس کر کے ایک اسکول میں ہیڈ مسٹریس بن گئی۔

تعلیم سے فارغ ہوتے ہی میری شادی بھی ہو گئی۔ میرا شوہر ایک سرکاری افسر تھا۔ جس کی وجہ سے اکثر ان کا تبادلہ ہوتا رہتا اور میں کبھی یہاں کبھی وہاں ان کے ساتھ گھومتی رہتی تھی۔ اس سلسلے میں ان دنوں ہمارا تبادلہ سانگھڑ میں ہو گیا تھا' جہاں ہم ایک بڑے سے بنگلے میں رہتے تھے ایک دن میں لان میں گھوم رہی تھی کہ سامنے گھر سے رونے کی آواز آئی۔ میں نے پوچھا تو کریم بخش چپڑاسی نے بتایا کہ "یہ میری بہن ہے اس کا شوہر نشہ کرتا تھا۔ اسی حالت میں ہلاک ہو گیا مرتے ہوئے میری بہن کو تپدق کا مرض بھی دیتا گیا۔ اب وہ آخری سانس لے رہی ہے۔"

میں نے اسے ڈانٹا۔ "تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ میں اس کا علاج کراتی۔"

کریم بخش نے روتے ہوئے کہا۔ "بیگم صاحبہ آپ لوگ جب سے آئے ہیں' وہ روزانہ کوارٹر کی کھڑکی سے آپ کو دیکھتی ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ بیگم صاحبہ میرے ساتھ پڑھتی تھی مگر اس نے مجھے سختی سے منع کیا ہے کہ میں آپ کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔ ادھر کل سے اس کی حالت بہت خراب ہے آنکھیں بھی نہیں کھول سکتی۔"

"میرے ساتھ پڑھتی تھی؟ کیا نام ہے اس کا؟"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"شانا"

"شائل"

یہ سنتے ہی میں کھڑی ہو گئی۔

میری آنکھوں کے سامنے بھنورا آنکھیں' مسکراتے ہونٹ' موتی جیسے دانت' خوبصورت شکل والی مغرور لڑکی کھڑی تھی۔ ویسا ہی مجسمہ' ویسا ہی حسن----- مگر ----- شفاف پردہ آہستہ آہستہ ہٹنے لگا میرے سامنے ہڈیوں کا پنجر پڑا تھا۔ ہڈیوں بھرے چہرے پر دو سوراخوں میں ٹمٹماتے ہوئے دو دیے تھے جو کسی بھی لمحے ہمیشہ کے لیے گل ہو سکتے تھے۔ الجھے مرجھائے بال تھے۔ میرے سامنے زندگی ایک بڑے تضاد کے ساتھ موجود تھی۔ شانا کا اجلا تن اس کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ شاید میں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔

جمال ابڑو

بدمعاش

وہ اول نمبر کا بدمعاش تھا' جھوٹ' دغا' فریب' چوری اور ڈاکہ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ پلک جھپکتے بڑے سے بڑا کام کر گزرتا۔ اس میں ذرا بھی رحم کا جذبہ نہ تھا۔ وہ جب کسی کو شکار کرتا تو پہلے چپ چاپ غصے میں کھڑا دیکھتا رہتا۔ ماتھے پہ بل ڈالے' دانت بھینچے' نتھنے پھلا کر شکار کو تکتا موقع پا کر حملہ کرتا اور اس کی انتڑیاں باہر نکال دیتا۔ ایک خطرناک پھل والی کلہاڑی کندھے پر رکھے شیر کی طرح جنگل میں پھرتا رہتا تھا۔ اگر کوئی شامت کا مارا اسے للکار بیٹھتا تو چپ چاپ گردن اٹھا کر اسے سرپاؤں تک دیکھتا پھر چیتے کی طرح گرجتا ہوا اسے دبوچ لیتا اور کلہاڑی کے مسلسل وار کر کے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر رکھ دیتا پھر تنکی کر چوڑا سینے اونچے کندھوں کے ساتھ مونچھوں کو تاؤ دیتا' ترچھی نظروں سے مردہ شکار کو گھورتا ہوا اپنے آپ میں مست ہو جاتا کسی کی ذرا بھر بھی پروا نہیں کرتا۔

وہ بچپن ہی سے ایسا تھا۔ اکثر اس کا باپ اسے مار مار' کر اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیتا مگر اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔ باپ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتا۔ لاتیں' گھونسے' تھپڑ مشین کی طرح اس کے جسم پر پڑتے' کوئی چھڑانے والا نہ ہوتا اگر ماں زندہ ہوتی تو وہ ہی چھڑاتی۔ مار کھاتا رہتا مگر ذرا آواز نہیں نکالتا۔ باپ اس سے زیادہ طاقت ور تھا۔ اس لئے تصور میں سمجھتا کہ اس نے باپ کی داڑھی نوچ لی ہے۔ اڑوس پڑوس والوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ ہم عمر ساتھیوں کو مار پیٹ کر بھاگ جاتا۔ ماں باپ چلاتے آتے۔ ہاتھ چڑھ جاتا تو دھنک کے رکھ دیتے۔ اپنا بچہ تھوڑی تھا جو نظر انداز کرتے یا پھر باپ کو جا کر شکایت کرتے جو پہلے ہی اس سے بیزار تھا۔ قصور دوسروں کا بھی ہوتا لیکن وہ سارا غم غصہ اس پر نکالتا۔ اس کو اس طرح مار پڑتی جیسے وہ مفت کا تھا۔ مار کھانے کے بعد اس کے سارے بدن میں اس قدر جلن ہوتی کہ وہ تادیر درد محسوس کرتا رہتا' تلملا اٹھتا مگر شکایت نہ کرتا اور دل ہی دل میں سوچتا کہ ٹھہر جاؤ مجھے بڑا ہونے دو' پھر گن گن کر بدلے لوں گا۔ وہ سوچتا رہا اور اس طرح بچپن کی منازل طے کرتا رہا کہ ایک روز ایک ہندو عورت کے چکیلے ریشمی کپڑوں کو ہاتھ لگ گیا اس کے منہ پر اس عورت نے اس زور سے تھپڑ مارا کہ اس کا سر گھوم گیا باپ کے پاس شکایت ہوگئی اس پر اس کے باپ نے بھی لاتوں اور مکوں سے اس کی مرمت کر دی۔ پہلی بار اسے باپ پر بہت غصہ آیا اور اس نے دل میں اسے بہت سی گالیاں دیں۔ "خنزیر" مگر وہ چھوٹا تھا۔ اس لیے غصہ پی گیا۔

اس نے اپنا سارا بچپن ایک میلی قمیض اور پھٹی ہوئی نکڑی میں لاوارثوں کی طرح پھر کر گزار دیا۔ مٹھی بھر اناج تک نہیں تھا کہ کوئی چیز خرید سکے۔ دوسرے بچے جھولیاں بھر کے کھاتے۔ مٹی کے کھلونے خریدتے۔ وہ اکیلا ہی سر پہ بازو باندھے آنکھیں پھاڑے کھڑا دیکھتا رہتا۔ چکنی مٹی کی گاڑی مٹی کے اونٹ کی نکیل کسی ہاتھ میں دیکھ کر اس کا دل چاہتا وہ بھی اسے ہاتھ لگا کر دیکھے مگر کون اپنی چیز کو ہاتھ لگانے دیتا ہے۔ غصے سے اس کی ناک کی چوٹی تک سرخ ہو جاتی اور ایک طرف بھاگ جاتا۔ کونے میں منہ دیئے دیوار پہ لکیریں کھینچتے ہوئے وہ منہ بسورتا ہوا ناک پونچھتا۔ کھلونے حاصل کرنے کی آرزو اس کے دل میں تڑپ بن گئی۔ اسی تڑپ کے ہاتھوں آخر ایک روز اس نے ایک کھلونا چرا لیا۔ سب کی نظروں سے چھپا کر رکھتا۔ چھپ چھپ کر کھیلتا پھر چھپا دیتا۔ چھوٹا سا کافور کا گڈا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں والا جیسے وہ اس کا بھائی تھا۔ ایک دن باپ نے دیکھا تو چھین لیا۔ بلک بلک کر روتے مار کھاتے اچھل اچھل کر اس نے وہ کھلونا چھین لینے کی کوشش کرتا رہا کہ اچانک بے چارہ گڈا اس کے باپ کے پیروں تلے آکر چکنا چور ہو گیا۔ اس نے زور زور سے چیخیں ماریں' غصے میں اس نے باپ کو "حرامی" تک کہہ دیا تو باپ نے لاتوں کی بوچھاڑ کر دی۔

اس دن وہ بہت رویا اس نے ٹوٹے ہوئے گڈے کے ٹکڑے سمیٹے اسے ایک کپڑے میں باندھ کر نالی میں بہا دیا اس دن کے بعد پھر وہ کبھی نہیں رویا۔

باپ تو اس کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ بھلا جسم کا کونسا حصہ تھا جہاں اس کی مار کے نشان نہ تھے۔ ایک دن جب باپ نے اس کو مارنے کے لیے جوتا اتارا تو وہ ڈنڈا اٹھا کر باپ کر مارنے دوڑا۔ باپ سمجھ گیا کہ اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ اس نے پھر کبھی اسے مارنے کی کوشش نہیں کی۔ اب وہ جوان تھا ایک ایسا نوجوان جسے تمام لوگوں کے ساتھ ازلی بیر تھا۔

بھلا کس نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا؟

نفرتوں کی آگ ایک ایک سانس میں دھک رہی تھی۔ لوگوں کو مارنے' تڑپانے' کچلنے میں اسے ذرا بھی ترس نہیں آتا تھا۔ لوگوں نے بھی تو اس کو اسی طرح مارا تھا۔ نفرت سے بھر دیا تھا۔ جتنی نفرت کا اظہار کرتا اس کے اندر نفرت کی آگ اتنی ہی روشن ہوتی۔ وہ خود بھی نفرت کی اس آگ کو روشن رکھنا چاہتا تھا۔

اس کے پاس ایک کتا تھا۔ چھوٹا سا پلا تھا جو اب پل کر اس کی طرح بڑا ہو گیا تھا' لیکن ایک روز وہ مر گیا تو اس روز وہ ایک بار پھر رو پڑا۔ ایک واردات کرتے ہوئے ایک بار پکڑا گیا۔ پولیس تھانے لے گئی۔ ابھی ذہن تھوڑا کچا تھا۔ اس لئے ڈر گیا۔ کہنے لگا "اللہ میاں اس بار رہا کرا دے پھر توبہ کر لوں گا۔" مگر جب اس کے منہ میں مرچیں ڈالی گئیں اس پہ ناروا سختیاں ہوئیں' تو اس کے اندر سے ڈر ختم ہو گیا۔ اس کی پیشانی پر تیوریاں اور آگ برساتی آنکھیں اس ٹل گئیں۔

پھر کتنی ہی بار پکڑا گیا مگر ذرا بھی خوف نہ محسوس ہوا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھتا تو سامنے والے کی سانس رکنے لگتی۔ ایسے ویسے پولیس افسر کو ہمت نہیں تھی کہ اسے کچھ کہہ سکتا۔ کسی بڑے آدمی کی چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ پولیس افسر پر دباؤ پڑا کہ مال واپس کراؤ۔ پولیس والے اس کے گھر آئے۔ اس کی بہن کو

اذیت ناک حد تک تنگ کیا۔ چوری برآمد تو کیا ہوتی۔ ایک نئی نفرت اس کے اندر بھر گئی۔ قید ہوا تو نفرت اور بھڑک اٹھی۔

قید ختم ہونے پر باہر آیا تو اس وقت تک بہن کا سامنا نہیں کیا جب تک اس نے بڑے آدمی کو جان سے نہ مار دیا۔ بات یہاں تک نہیں رکی۔ اس نے ان پولیس افسران کی بھی جان لے کر اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کیا۔ جنہوں نے اس کی بہن کی بے عزتی کی تھی پھر وہ روپوش ہو گیا مگر روپوشی کیا تھی۔ وہ تو وہیں تھا بس پولیس کی پہنچ سے باہر تھا۔ اب اس کی وحشت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ جب وہ کسی کو شکار بناتا اور اس کی گردن کاٹتا۔ مرنے والے آدمی کے نرخروں سے خرخراہٹ کی آواز کے ساتھ لہو کا فوارہ پھوٹ پڑتا تو وہ عجب لذت آمیز جذبے کے ساتھ اسے گھورتا رہتا۔ جیسے بہتے ہوئے خون سے اپنے جذبوں کو تسکین دے رہا ہو۔ ایسے حال میں حسب معمول اس کی تیوریوں پر بل ہوتے اور آنکھیں ترچھی۔

اس نے باراتیں لوٹیں دولہا دلہن کو شکار بنایا۔ نوٹوں کے انبار لگائے اور پھر خود ہی جلا دیئے لیکن اس کی ترچھی آنکھوں اور تیوریوں کے بل میں کوئی فرق نہ آیا ایک بار اپنے ایک دوست پر غصہ آیا تو اس کی انتڑیاں نکال کر رکھ دیں' اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ پھر خوب چیخیں مار کر رویا۔ آٹھ پہر کھانا نہیں کھایا۔ مونچھیں نیچے ڈھلک آئیں' دوست کی قبر پر فاتحہ پڑھی پھر خون سے بھری کلہاڑی کو اس طرح خون والی جگہ پر دفن کر دیا جیسے اپنی بڑائی اور مستی کو دفن کر دیا ہو۔۔۔۔ اور پھر۔۔۔۔۔ ایک دن پکڑا گیا۔ ایک واقعہ تو نہیں تھا۔ جانے کتنے مقدمے بنے تھے۔ جیل اس کے لئے نیا تجربہ تو تھی نہیں۔ جیل کی دنیا اس کا جانی پہچانی تھی مٹی بھری روٹی اور موبل آئل میں پکی دال۔ چرس بھنگ کا کاروبار' حرام کاری پر جھگڑے' سارے کے سارے چاہے قیدی ہوں یا افسر' اندر سب ایک جیسے تھے۔ وہ گدھے کی طرح سارا دن کام کرتا تھا۔ گردن جھکائے چپ چاپ اپنی دھن میں مست رہتا تھا دو چار دن گزرے تو ایک دن پتھر توڑتے توڑتے اس کی پیٹھ پر جمعدار نے خواہ مخواہ ڈنڈا دے مارا اس نے گردن پھری کر اور بھنویں سکیڑ کر اس کو دیکھا۔ جمعدار کو غصہ آیا اور گالیوں کا طوفان اس کے منہ سے ابل پڑا۔ ڈنڈا اس کے چہرے کے قریب لاتے ہوئے کہنے لگا۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟" آہستہ آہستہ اس کی تیوریوں پر بل پڑنے لگے اور آنکھیں ترچھی ہوئیں۔ دانت پیستے ہوئے دھارا جیسے اس کے اندر کا وحشی جاگ گیا ہو۔ جمعدار کو اپنی گرفت میں لیکر اس کے بازو کو اس شدت سے مروڑا کہ تڑاخ کی ایک آواز کے ساتھ جمعدار کا بازو ٹوٹ گیا۔ ہنگامہ مچ گیا۔ سپاہیوں کی بندوقیں چھوٹ کر گرنے لگیں۔ قیدیوں کو فرار ہونے کا موقع مل گیا اور وہ بھی بھاگ نکلا اور اپنی پناہ گاہ پر پہنچ کر اس نے دوبارہ اپنی کلہاڑی کھود کا نکالی غور سے اسے دیکھا جیسے انسانی سروں کے ٹکڑے گن رہا ہو پھر خود بخود اس کی آنکھیں ترچھی ہو گئیں' وہ نفرت سے مسکرایا۔ کلہاڑی کو اوپر اٹھا کر چوما' اس کو اچھی طرح دیکھا بھالا جیسے کسی نئے سفر پر روانہ ہو رہا ہو۔

نئے سرے سے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ سوئے ہوؤں کو مار دیا' بے گناہوں کو کاٹ کے رکھ

دیا' گھر جلائے' عورتوں کی چیخ پکار' بچوں کا رونا' آگ کے شعلے دیکھتا ہوا آگے چل دیتا۔ بار بار مڑ کر دیکھتا۔ نہ خوشی نہ غم۔ وہی تیوریوں پر بل اور ترچھی آنکھیں۔ جلتے ہوئے یا مرتے ہوئے آدمی کو دیکھ کر تھوک کی پچکاری مارتا اور آگے بڑھ جاتا۔ ایک دفعہ دن دھاڑے ڈاکہ ڈالا۔ سارے گاؤں کو مٹھی میں کر لیا جو جہاں تھا' سہما ہوا اور خاموش تھا۔ وہ خود گردن اکڑا کر چل رہا تھا۔

ایک گھر کے آنگن میں چلتے ہوئے کسی کھلونے پر پاؤں پڑ گیا۔ ایک ڈھائی سالہ بچے نے ماں کی گود میں مچل کر کہا۔

"گندہ علامی۔"

اس نے مڑ کر دیکھا خوفزدہ ماں نے جلدی سے بچے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور سینے سے چمٹا لیا۔ بے چاری کی آنکھوں میں خوف گہرا ہو گیا تھا بچے کو اور بھی زیادہ زور سے سینے سے چمٹا لیا۔ آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

کیا تھا ماں کی آنکھوں میں!

وہ بالکل پتھر بن گیا۔ بچے کی طرف دیکھا' ٹوٹے ہوئے کھلونے کی طرف دیکھا۔ ماں کا بچے کو سینے کے ساتھ چمٹانا دیکھا۔

بچہ ماں کی گود میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہ دیکھتا رہا۔ اسے اپنا بچپن یاد آگیا تھا۔ اس کی تیوریوں کے بل آہستہ آہستہ غائب ہوتے گئے ترچھی آنکھیں سیدھی ہوتی گئیں۔ اس نے جھک کر ٹوٹا ہوا کھلونا اٹھایا ٹکڑے جوڑ کر آگے بڑھا اور عورت کے ہاتھ میں دے دیا اور پھر کیا ہوا کہ پکڑا گیا یا اس نے خود کو پکڑوا دیا یہ کسی کو خبر نہ تھی۔ اس کے کچھ ساتھی مارے گئے' کچھ نے اس کے خلاف گواہی دے دی۔ عورت نے بھی اس کے خلاف گواہی دی اور ثبوت کے طور پر ٹوٹا ہوا کھلونا عدالت میں پیش ہوا۔ اسے عمر قید کی سزا ہو گئی۔ وہ خاموش تھا بالکل خاموش اس کی تیوریوں پر بل نہیں تھے۔ آنکھیں ترچھی نہیں تھیں جیسے وہ دور کہیں دور خلاؤں میں دیکھ رہا ہو' جیسے عورت کو۔۔۔۔ بچے کو۔۔۔۔ اس کے بازوؤں کو جو وہ اپنی ماں کے گلے میں ڈالے خوف سے لرز رہا تھا' یا پھر اس گڈے کو' جو اس کے پاؤں کے نیچے آکر ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے کانوں میں بس ایک ہی آواز آرہی تھی۔ گندہ۔۔۔۔ علامی۔۔۔۔ اسے سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ جہاں لنھے جمعدار کو جیلر بنا دیا گیا تھا۔

جیلر نے اسے دیکھتے ہی اپنے اندر انتقام کی آگ روشن کر لی اسے بیڑیاں پہنائیں گئیں اور درخت کے ساتھ الٹا لٹکوا دیا مگر اس نے کوئی مزاحمت نہ کی' نہ اس کی تیوریوں پر بل پڑے نہ اس کی آنکھیں ترچھی ہوئیں۔ وہ ساری رات چپ چاپ درخت سے الٹا لٹکا رہا اور جب صبح اسے درخت سے اتارا گیا تو بس اس کا جسم رہ گیا تھا۔ روح رات کے کسی لمحے اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ کر جا چکی تھی' جیلر نے درخت کے نیچے پڑے ہوئے اسے دیکھا اور نفرت سے اس کی لاش کو ٹھوکر مارتے ہوئے بڑبڑایا۔

"بدمعاش"

حمید سندھی

سمندر اور میں

سمندر اور میں دونوں اکیلے۔ اس کی لہریں جھاگ سے بھری ہوئی ہیں اور میرے من کی لہریں سوچ اور فکر سے بھری ہوئی۔ میرے لئے وہی زندگی تھی' ویسی ہی جیون جوت تھی' اس لئے سمندر اور میں دونوں اکیلے تھے' دونوں ایک جیسے ایک دوسرے کے ساتھی۔ لہریں تیزی سے آکر میرے پیروں میں گدگدی کرکے واپس چلی جاتیں تھیں اور سوچیں میرے دل کو گدگدا کر مذاق اڑا رہی تھیں ' ایک وقت تھا جب سمندر میرا رقیب تھا' لیکن اب ہم دونوں آپس میں دوست ہیں' گہرے دوست ایک دوسرے کے ہمراز' محبت کے میدان میں وہ جیت کر بھی ہارا تھا اور میں ہار کر بھی جیت گیا تھا' لیکن وہ جیت میرے لئے کسی عذاب سے کم نہیں تھی۔ میں نے تمام زندگی عذاب سہے ہیں لیکن یہ عذاب تو میری زندگی پر چھا گیا ہے' لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے دل بذات خود ایک درد ہے اور وہ خود ہی یہ درد برداشت کررہا ہے۔ سمندر کتنی ہی پیار والی ہستیوں کو اپنے اندر پناہ دے کر خود دکھی رہتا ہے۔ اس کے من کا درد کبھی بھی ختم نہیں ہو سکتا۔

بیٹھے بیٹھے' سوچتے ہوئے خود کو بہت عجیب سے احساسات میں گھرا ہوا پایا۔ اسی جذبے کے تحت ایک گھر بنانا شروع کیا۔ ریت کو بڑی چاہت اور پیار سے ایک جگہ جمع کیا۔ آہستہ آہستہ دیواریں بننے لگیں۔ کمرے بنے' برآمدہ بنا۔ ان کے اوپر چھت پڑی اور ایک چھوٹا سا خوبصورت گھر بن کر تیار ہوگیا۔ میں دل میں بہت خوش ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے آنگن میں بہار آگئی ہے اور میں آنگن میں بچھے ہوئے پلنگ پر جاکر بیٹھ گیا... مجھے یوں لگا جیسے میرے سامنے خوشیوں کے انبار لگ گئے ہوں اور میں آہستہ آہستہ ان سے ایک ایک خوشی اور دل کی چاہت نکالتا گیا ہوں۔

میری آنکھوں پر کسی نے گورے گورے نرم و نازک ہاتھ رکھ دیے۔ ان ہاتھوں کو میں نے اپنی آنکھوں سے مس کرتے ہوئے کہا "زوبی" اور کسی نے ہاتھ ہٹا دیئے۔ چاروں طرف موسیقی پھیل گئی اور وہ ہنستی ہوئی میرے برابر آکر بیٹھ گئی۔

"زوبی پورا دن گزر گیا' آئیں کیوں نہیں؟"

"اور تم' بھلا کہاں تھے؟"

"میں؟... میں تمہارے پاس زوبی! ان کالی پلکوں والی بڑی بڑی آنکھوں میں ہی تو بیٹھا تھا۔"

"ہوں! میں بھی کہوں کہ آج تمام دن میری آنکھیں بند کیوں نہیں ہورہی تھیں' اب کہیں جاکے

قدرے ہلکی ہوئی ہیں۔ اچھا میں کچھ دیر کیلئے سو جاؤں جمیل!"

"زوبی تمہارے یہ پھیلے ہوئے سنہری بال ایسے لگ رہے ہیں' جیسے چاند کے ساتھ رات بھی نیچے زمین پر اتر آئی ہو اور کہہ رہی ہو کہ میرے دامن میں پھیلی ہوئی خوشیوں کو دیکھو۔ اس میں خوبصورت اور دل لبھاتے رنگوں کو دیکھو۔ رنگوں کی دنیا' رنگوں کی کائنات میری زوبی ہم بہت جلد ایک ہو جائیں گے۔"

زوبی نے خاموشی سے میری بات سنی۔ اچانک اچھل کے وہ دور جا کر کھڑی ہو گئی۔ ایک دم زوبی کی نظریں بدل گئی تھیں۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ میرے لئے اجنبی ہے اور ابھی ابھی کہیں دور نکل گئی ہو' بہت دور۔

"کیوں زوبی تم ناراض ہوگئیں کیا؟" میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے پوچھا' کیونکہ وہ بہت عجیب طبیعت کی مالک تھی۔ اس کے انداز بے حد نرالے تھے' خوشی کی باتوں پر رنجیدہ ہو جاتی تھی اور غم کی باتوں پر قہقہے لگایا کرتی تھی۔

"نہیں جمیل میں کیوں ناراض ہونے لگی۔ خیر چلتی ہوں امی میرا انتظار کررہی ہوں گی۔"

وہ ہمیشہ کی طرح شادی کی بات ٹال کر چلی گئی۔ میں سوچتا رہ گیا۔ میں جب اس قابل ہوا کہ زندگی کے دامن میں پھیلے رنگوں کو نہ صرف پرکھ سکوں بلکہ ان کو پھیلا کر ان میں زیادہ خوش رنگی پیدا کر سکوں تب میں نے بڑے بڑے پروگرام بنائے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ ایک چھوٹا سا گھر ہو' خوشیوں سے بھرپور۔

میں نے جب اس پہاڑی پر یہ پلاٹ خریدا تھا تو اس وقت ہی مجھے احساس ہوگیا تھا کہ میں بہت خوش نصیب ہوں کہ ایسا پلاٹ ملا ہے۔ گھر بنواتے بنواتے میں اس پہاڑی پر پھیلے ہوئے چھوٹے چھوٹے خوبصورت گھروں اور کوٹھیوں کو اس طرح پہچاننے لگا تھا' جس طرح میں اپنی آفس کی میز پر رکھے گلدان کے پھولوں کو جن کے مختلف رنگ۔ جب میں کسی سوچ میں گم ہوتا تھا تو وہ میرے سامنے قوس و قزاح بن کر پھیل جاتے تھے' جس کے آر پار میں زندگی کے حسین خواب دیکھتا تھا' جب بھی میں کوٹھیوں اور بنگلوں کے سامنے سے گزرتا تھا' زندگی کے رنگ برنگے روپ دیکھتا تھا۔ میرے بنتے ہوئے گھر کے نزدیک دو خوبصورت بنگلے تھے' جنکی زیادہ تر خوبصورتی تو اس گھر کے باسی تھے۔ ایک بنگلے میں ایک ڈاکٹر رہتا تھا۔ ڈاکٹر اور اس کی بیوی دونوں بہت پرخلوص طبیعت کے مالک تھے۔ جب بھی میں ان کے گھر جاتا تھا تو ڈاکٹر' اس کی بیوی اور دونوں بیٹیاں میری بہت خاطر مدارت کرتے تھے۔ میں ان کی دلچسپ باتوں میں کچھ دیر کے لئے گم ہو جاتا تھا۔

دوسرا بنگلہ زوبی کا تھا۔ زوبی اپنی امی کے ساتھ اس گھر میں رہتی تھی۔ اس وقت وہ گریجویشن کررہی تھی جب میرے ساتھ جان پہچان ہوئی تھی۔ اس کی ماں بھی بہت اچھی تھیں۔ زوبی کا باپ ایک بہت بڑا تاجر تھا اور اکثر اپنے کاروبار کے سلسلے میں باہر رہتا تھا۔ زوبی کی امی کافی تیز خاتون تھیں جب بھی آتیں پہلا سوال یہی کرتی تھیں۔

"بیٹا جمیل۔ تمہارا گھر آخر کب تک بن جائے گا' جب دیکھو کہ نامکمل ہے۔ مزدوروں کو مزدوری نہیں دیتے کیا؟"

"نہیں امی دیواریں تو پوری ہو گئی ہیں۔ اب جلد ہی چھت بھی پڑ جائے گی پھر تو تھوڑا سا کام باقی رہ جائے گا۔" دیواریں بنیں' چھت پڑی۔ میں نے محسوس کیا دیواریں بنتے بنتے میری محبت کا محل بھی بنتا گیا۔ زوبی کی محبت کا درد میرے دل میں سما چکا تھا۔ آہستہ آہستہ ہم دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے کہ ایک دوسرے کے بغیر چین ہی نہیں آتا تھا۔ میرے آفس سے واپس آنے کے بعد زوبی فوراً میرے گھر آجاتی' ہم لوگ دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے۔ شام ڈھلے وہ گھر واپس جاتی اور میں اکیلا رہ جاتا تھا۔ صبح سویرے وہ آتی اور کھلی ہوئی کلی کی طرح میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر کالج جاتی' میں اسے کالج اتار کر اپنے دفتر چلا جاتا تھا۔

ایک دن جب زوبی اپنے گھر جارہی تھی تو پتہ نہیں کیوں مجھے محسوس ہوا کہ زوبی کو جانا نہیں چاہیے۔ اس کو اس گھر کی بہار بننا چاہیے۔ اور اس کی ویرانی میں بہار ضرور آئے گی... میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر بٹھا دیا۔

"زوبی۔ تم نے دیکھا ہے کہ جب تم آتی ہو تو اس ویران اور اکیلے گھر کے لئے بہاریں لے کر آتی ہو جن کے سائے پورے گھر میں بکھر جاتے ہیں اور چاروں طرف خوشگوار موسیقی پھیل جاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس گھر کی بہار بن کر یہیں رہو۔ اس کیلئے میں امی سے بات کروں گا...... میرا خیال ہے زوبی کہ میں......"

میں نے ابھی اپنا جملہ بھی پورا نہیں کیا تھا کہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

"میں جارہی ہوں جمیل' امی میرا انتظار کررہی ہوں گی۔"

ہمیشہ کی طرح اپنا مخصوص جملہ دہراتی' بات کو ٹال کر چلی گئی۔ میں جب بھی اس قسم کی بات چھیڑتا تھا' اس کے چہرے کی رنگت بدل جاتی اور وہ اندرونی کیفیت سے مجبور ہوکر چلی جاتی تھی۔

پھر ہم سمندر کے کنارے جانے لگے۔ گھر سے خوش خوش نکلتے تھے اور واپسی پر زوبی خاموش ہوتی تھی' اور میں اداس۔ دونوں کے چہرے اترے ہوئے اور مرجھائے ہوئے ہوتے تھے۔ میں پیار کی باتیں کرتے کرتے شادی کا ذکر چھیڑتا تھا اور زوبی خاموش ہو جاتی تھی۔

ایک دن سمندر کے کنارے سورج کوڈوبتا دیکھ کر زوبی بولی۔ "اللہ یہ سمندر کتنا ظالم ہے؟ سورج کے روشن مکھڑے کو کس بے دردی سے پانی میں غرق کر دیتا ہے اور پھر صبح اسے ٹھوکر مار کے سمندر سے باہر دھکیل دیتا ہے۔"

"نہیں زوبی ایسے نہیں ہے سمندر کا اتھاہ سینہ تو ایک گھر کی طرح ہے' جہاں سورج محبت کے نغمے سنتا ہے۔ سارے دن کی تھکن اتارنے کے لئے وہ سمندر کی گود میں پناہ لے لیتا ہے اور سمندر ساری رات اسے اپنے دامن میں تھپکیاں دے کر سلا دیتا ہے اس طرح سورج' صبح تازہ دم ہوکر اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیتا ہے۔ کتنا گہرا رشتہ ہے دونوں میں۔"

"کم از کم میں تو اس جذبہ کو پیار جیسا مقدس نام نہیں دے سکتی ہوں اگر یہ پیار ہوتا ہے تو خود غرضی کس کو کہتے ہیں؟ دراصل کسی کو کسی سے پیار نہیں ہوتا جمیل' ہر کوئی کھوکھلا اور ہر ایک پیاسا ہے' ہر کوئی اپنے کھوکھلے پن کو بھرنا چاہتا ہے اور ہر ایک اپنی پیاس بجھانے کے لئے سرگرداں رہتا ہے۔ پھر کسی کے پیمانے محبت سے بھر جاتے ہیں تو کسی کا پیالہ صرف یادوں سے بھر جاتا ہے۔

سمندر اور سورج صرف رات گزارنے کے لئے ایک دوسرے کا سہارا لیتے ہیں۔ صبح کو سمندر اپنی لہروں سے کھیلنے میں مشغول ہو جاتا ہے اور سورج کی سنہری کرنیں ان کھلی کلیوں کے مکھڑے چومنے میں لگ جاتی ہیں۔ دونوں ہرجائی ہوئے نا؟"

میں سوچ میں پڑ گیا کہ وہ کہنا کیا چاہتی ہے؟ میں سمجھ ہی نہیں سکا اور شاید سمجھ بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ زوبی سے مجھے عام سا پیار تھا...... پیار جو عام ہی ہوتا ہے۔میں نے شادی کے مسئلے پر زوبی کی امی سے بات کی تو وہ بہت خوش ہوئیں اور کہنے لگیں۔

"زوبی ہی تو میری زندگی ہے بیٹا' وہ جیسے کہے گی ویسا ہی ہوگا۔"

واقعی ہوا بھی وہی جو زوبی نے کہا۔۔۔ اس نے میرے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے اس سے پوچھنا چاہا تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور میں نے دکھ اور غصہ سے اس سے بات کرنی چھوڑ دی۔

وہ اپنے مقررہ وقت پر روزانہ آتی اور میری غیر موجودگی میں میرے ملازم سے میرے بارے میں پوچھ کر چلی جاتی تھی۔

ایک دن شام کے وقت میں جیسے ہی اپنے بنگلے سے باہر نکلا تو میرے قدم وزنی ہوکر رک گئے۔ جو کچھ میں نے دیکھا' تو دکھ کا جان لیوا احساس ہوا۔ زوبی ایک کالج کے لڑکے کے ساتھ قہقہے لگاتی ہوئی جاری رہی تھی۔

میرا دماغ سوچنے کی صلاحیتوں سے یک سر خالی ہوگیا اور میں بے خیالی میں ساتھ والے بنگلے میں گھس گیا۔

سامنے ڈاکٹر کی بڑی بیٹی سلمٰی بیٹھی تھی۔

"او...... جمیل صاحب! آئیں' آئیں آج کیسے رستہ بھول گئے ہیں اس طرف کا۔"

ڈیڑھ' دو گھنٹے کی گفتگو کے بعد پتہ نہیں کیوں مجھے محسوس ہوا کہ سلمٰی کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے۔ اس کی باتیں شائستہ اور گمبھیر تھی جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر عجیب سا رنگ تھا۔ عمر میں وہ مجھ سے تھوڑی سی بڑی ہوگی' لیکن کوئی خاص فرق نہیں لگ رہا تھا' اس کے چہرے کی معصومیت اور من بھاتی گفتگو مجھے روزانہ شام کو کھینچ کر اس کے گھر لاتی تھی' اور میں گھنٹوں ان کے پاس بیٹھا دل بہلاتا رہتا تھا۔ سلمٰی سے اکثر زندگی کے مسئلوں پر کافی دلچسپ بحث ہوتی تھی' لیکن جیسے ہی باہر نکلتا تھا۔ سامنے زوبی کا بنگلہ ہوتا تھا...... اور زیادہ تر زوبی کو کسی نہ کسی لڑکے کے ساتھ دیکھتا تھا۔ کبھی گھومنے جارہے ہوتے اور کبھی واپس

آرہے ہوتے تھے۔ اس کے باوجود وہ میری غیر موجودگی میں میرے گھر آنا نہیں بھولی تھی' کبھی ناغہ نہیں کیا تھا' جبکہ میں نے اس سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔

پھر پتا نہیں کیسے ہوا' کچھ بھی پتا نہیں چلا' میری سلمٰی سے شادی طے ہوگئی۔

شادی طے ہوجانے کے بعد ایک دن اچانک زوبی سے سامنا ہوگیا۔

"جمیل صاحب مبارک ہو۔ آپ کی شادی کا سن کر بہت خوشی ہوئی۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔" میں نے جواب دیا۔

"دعوت بھی دو گے یا صرف مبارک وصول کرو گے؟"

"ضرور' ضرور' پڑوس میں رہتی ہو۔ آخر پڑوسیوں کو نہیں بلاؤں گا تو پھر کس کو بلاؤں گا۔"

"یوں ہی سہی۔ بلاؤ گے تو نہ۔"

شادی میں زوبی نے ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ شرکت کی' ہر مذاق میں آگے آگے تھی' لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے محسوس ہوا کہ جیسے وہ کچھ کھو کر آئی ہو' یا پھر وہ خوابوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکی ہو۔

اس رات زوبی میرے حواسوں پر اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ میں نے سلمٰی میں بھی زوبی کو دیکھنا چاہا تھا اور وہ مجھ سے بیزار بیزار سی لگ رہی تھی۔ صبح کو میں جیسے ہی باہر نکلا تو ملازم نے ایک خط لاکر مجھے دیا لکھا تھا۔

> "جمیل' سمندر سے سورج جدا ہو چکا ہے۔ آج میری ہمدردیاں سمندر کے ساتھ ہیں۔ میں اس کی گود میں سکون کی تلاش میں جارہی ہوں۔ شاید میرا وہی گھر ہے۔ میں پیار کو پہچان نہیں سکی تھی۔ آج جب تمہیں کھو دیا ہے تو پتہ چلا ہے کہ پیار کیا ہوتا ہے۔"
>
> زوبی

میں اسی وقت سمندر کی طرف بھاگا۔ چھوٹے سے پیروں کے نشان تلاش کرتا ہوا ریت کے ایک ٹوٹے ہوئے گھروندے کے پاس پہنچا تو وہاں سے قدم آگے بڑھے آگے....... آگے..... اور میں نے لہریں دیکھیں کھیلتی ہوئی لہریں۔ یہ لہریں آگے بڑھ رہی ہیں؟........ آگے بڑھ رہی ہیں اور پھر میرا بنا ہوا یہ ریت کا گھر بھی مسمار ہوگیا۔

میں نے چڑ کر سمندر کی طرف دیکھا۔ سورج سمندر کی گود میں پناہ لے رہا تھا۔ مجھے بھی کسی کی گود میں پناہ لینی ہے۔ سلمٰی۔ جس کی گود اسی سمندر کی طرح ہے' جو سورج کو حاصل کرکے بھی خالی خالی اور اکیلا تھا۔ سمندر اور سورج' میں اور میرا گھر۔

خیر النساء جعفری

تخلیق کی موت

ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی عید آئی اور گزر گئی۔ حسب دستور اس عید پر بھی صوفوں اور کشن کے غلاف بدلے گئے' قالین کو جھاڑا گیا' بتیوں کی جھاڑ پونچھ کی گئی' پردے تبدیل کئے گئے تھے اور باورچی خانے میں سگھڑاپی(۱) چاولوں کی مہک اٹھ رہی تھی۔

زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں' بڑی با اعتبار ہوتی ہیں' جو ہمیشہ دہرائی جاتی رہتی ہیں اور دہرائی جاتی رہیں گی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں' ہلکی پھلکی یادیں' خوبصورت موسم' پیارے رواج اور اچھی رسمیں جن میں سے کئی تو قابل بھروسہ ہوتی ہیں' اور ناقابل بھروسہ اگر کوئی ہے' تو وہ ہے' سانس کی ڈوری جو ٹوٹتے دیر نہیں لگاتی۔

اس عید پر بھی ہر کام اس طرح ہوا' جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے' اور نہیں ہے تو عزیز!

عزیز میرا دوست تھا۔ دوست بھی اسے اب کہہ رہی ہوں' کیوں کہ میں بھی دوسری کی طرح مردہ پرست ہوں' ورنہ نظروں کے سامنے ہوتا تھا تو دشمن سمجھتی تھی۔ اس کے علاوہ میرے اور عزیز کے درمیان ایک دوسرا رشتہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ عزیز میری امی کی ماں کا بیٹا اور میرے نانا کا عشق تھا۔ اس حوالے سے وہ میرا ماموں بھی تھا۔ خیر ماموں تو وہ میرا اس لئے تھا کہ وہ میری نانی اور نانا کا بیٹا تھا' باقی سچ سچ تو وہ میرا دوست تھا۔

عزیز کو "عزیز" بھی اب کہہ رہی ہوں' جبکہ نظروں کے سامنے نہیں ہے' ورنہ سامنے ہوتا تھا تو اسے ہمیشہ "یزید" کہہ کر مخاطب کرتی تھی' کیونکہ وہ مجھے ہمیشہ نظروں میں کھٹکتا رہتا تھا۔

اس کی عمر آج سے ایک سال پہلے اتنی تھی' جتنی کہ اب میری ہے' اور میری عمر تب پورے پچیس برس تھی۔ ہم دونوں کی عمریں ایک جتنی تھیں۔ ذائقے ایک جیسے پسند تھے' عادتیں ایک جیسی تھیں اور نوکریاں بھی ایک جیسی ہی تھیں۔ جیسے دونوں ایک جتنے اور ایک جیسے' ایک طرح کے تھے اور فرق تھا تو صرف حالات کا۔

انگریزی محاورے کی طرح عزیز بھی منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا تھا اور میں بھی' مگر اتفاق سے حالات نے میرا ساتھ دیا اور میرا "چمچہ" قائم رہا' لیکن عزیز کا "چمچہ" چھوٹ گیا' جب عزیز مشکل سے پاؤں پاؤں چلنا سیکھ رہا تھا کہ میرے نانا فوت ہو گئے تو عزیز بھی دربدر ہو گیا۔ روکھا سوکھا کھایا اور ہمیشہ

ہوسٹل میں رہا۔ بے حد تکالیف سہ کر پڑھا۔ چھوٹی سی عمر میں تو اسے چمچ پکڑنا نہ آیا لیکن بڑے ہو کر بھی عزیز' وہ "سونے کا چمچہ" پھر کبھی حاصل نہ کر سکا۔

میں اور وہ تعلیمی میدان میں ایک ساتھ چلے تھے۔ میٹرک سے لے کر ایم۔اے تک۔ عزیز ہمیشہ پرائیویٹ طور پر پڑھا' کیونکہ اتی روپوں کی "نچری" حاصل کرنا اور نبھانا کوئی مذاق تو نہیں تھا نا؟ اور جب ہم نے ایم۔ اے کیا تب ایک دفعہ پھر وہ اکیلے سو دوسو روپے کی نوکری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ویسے جینے کے لئے عزیز نے بھی ہمت نہیں ہاری تھی لیکن اس مرحلے پر بھی میں ساڑھے چار سو کی نچری لے کر اس سے جیت گئی تھی۔

عزیز رہتا تو گاؤں کے ہاسٹل میں تھا' مگر نظر آتا تھا ہمیشہ حیدر آباد میں۔ چینی کا جہاز اگر ڈوب جاتا تو بھی اتنا دکھ نہ کرتی جتنا عزیز کو دیکھ کر ہوتا تھا۔

جب بھی دروازہ کھولو' سامنے اکثر' عزیز کھڑا ہوتا تھا۔ کبھی کہتا تنخواہوں کے بل پاس کروانے کے لئے آیا ہوں' کبھی بچوں کی کتابیں لینے کے بہانے کرتا تھا' کبھی شاگردوں کی یونیفارم بنوانے کے بہانے کرتا تھا' مگر میرا ذاتی خیال تھا کہ ان سب چیزوں کے علاوہ اہم کام جو اس کو ہر دوسرے تیسرے دن سفر کی صوبتیں برداشت کرنے کے لئے آمادہ کرتا تھا وہ اس کا فلم دیکھنے کا شوق تھا۔

میں اس کو آتے دیکھ کر فوراً اپنے کام جا لگتی۔ جلدی جلدی فرج کو تالہ لگا کر چابی جاکر رکھتی تھی تکیے کے نیچے! اس کے بعد باتھ روم میں جا کر الماری سے صابن' تیل' کنگھی' پیسٹ' تولیہ' اور ایسی دوسری چیزیں نکال کر ان کی جگہ کوئی بالو چالو سامان رکھ دیتی تھی۔ وہ سامان میں اس کی محبت میں نہیں رکھتی تھی' بلکہ اس لئے کہ اگر سرے سے کوئی چیز نہیں دیکھے گا' تو وہ یقیناً سمجھ جائے گا کہ یہ چیزیں میں نے غائب کی ہیں اور وہ کسی نہ کسی طرح' نظریں بچا کر میرے کمرے سے وہ چیزیں نکال ہی لیتا تھا۔

میری اس سے خوامخواہ دشمنی برائے دشمنی نہیں تھی بلکہ اس کے کام ہی ایسے تھے۔ صابن اگر اٹھاتا تو پوری ٹکیہ پیروں پر ضائع کرتا تھا۔ چار آدمیوں کا پیسٹ ایک ہی وقت میں پورا کرتا تھا۔ تیل کو اس وقت تک نہیں چھوڑتا تھا جب تک باقاعدہ اس میں غوطہ نہ لگا لے۔

میرا خیال تھا کہ عزیز صرف حیدر آباد ہی آکر خود کو بناتا سنوارتا ہے۔ باقی جتنے دن گاؤں میں ہوتا ہے' ایسی زحمت ہی نہیں اٹھاتا تھا' اس لئے مجھے اس کی انہیں باتوں پر غصہ آتا تھا۔ چلتے ہوئے بوٹ کی ایڑیاں اتنی زور سے زمین پر مار کر چلتا تھا کہ آدھ میل سے اس کے آنے کا اعلان ہونے لگتا تھا۔

کھانے کی میز پر مجال ہے کہ کوئی اس کے ساتھ بیٹھ کر پیٹ بھر کر کھا سکے۔ اچھی خاصی میز کے رومانی ماحول پر "چپڑ چپڑ" کر آواز سے پانی پھیر دیتا تھا۔ اس کی اسی بے ڈھنگی روش کی وجہ سے گھر کے باقی افراد کی عام طور پر اور میری خاص طور پر نہیں بنتی تھی۔ خاموشی سے تو کبھی بیٹھا ہی نہیں' کبھی اس چیز میں ہاتھ ڈالتا تھا کبھی اس چیز میں۔

ادھر ادھر دیکھ کر سیدھا ڈرائنگ روم میں جا گھستا' صوفے سے کشن اتار کر سرہانے رکھتا تھا۔ بوٹ

جو مٹی اور دھول میں اٹے ہوتے تھے۔ وہ پٹختا تھا قالین پہ' اس کے بعد سر کو فرش پر رکھتا پینے سے تر پاؤں صوفے پر رکھتا تھا۔ کھانا کھا کر ہاتھ تو کبھی تولیے سے نہیں پونچھتا تھا' کیونکہ بقول اس کے "دیواریں اور پردے آخر کس لئے ہوتے ہیں۔" میں اس کے بے ڈھنگے پن پر بیس دفعہ ٹوک بھی چکی ہوں گی' مگر اس پر کوئی اثر ہوتا ہی نہیں تھا۔ ہمیشہ مکر جاتا تھا کہتا تھا "کیا ثبوت ہے کہ دیواروں پر لگے ہوئے نشانات' کشن پر تیل کے نشان اور کورز پر پیروں کے نشان میرے ہیں؟"

پھر میں ہوتی تھی موقع کی تلاش میں کہ کسی طرح سے اس کو رنگے ہاتھ پکڑ کر شرمندہ کروں کہ آئندہ کم از کم اس طرح کرنے سے باز رہے!! اور......پھر......ایک دفعہ میں نے اس کو موقع پر پکڑا بھی تھا۔ اس کے پان میں رنگے ہاتھوں اور دیوار پر تازہ پڑے ہوئے دھبوں سے فنگر پرنٹس ملا کر بطور عینی شاہد کے امی کو بلا کر لائی تھی۔ جائے واردات پر ثبوت ثابت ہونے کے بعد میں نے امی کو براہ راست اور عزیز کو بتوسط نوٹس دیتے ہوئے کہا کہ "امی اگر آئندہ ایسا ہوا تو میں کیس سیدھا ریفر کروں گی' سپریم کورٹ میں بابا کے آگے...." امی کو پتہ تھا کہ بابا میرا کتنا مان رکھتے ہیں۔ دوسرے' بابا کی طرح جب میں بھی بولنے پر آتی تو رکتی نہیں تھی۔ یہ باتیں اگر بابا کے کانوں میں پڑگئیں تو اسی وقت اسے نکال دیں گے۔ اس وقت سے امی نے عزیز کو اتنی سختی سے ڈانٹا تھا کہ غریب عزیز سمجھ ہی نہیں سکا کہ بہن میں یہ ناگوار تبدیلی گرفتاری سے پہلے کی(Bell befor arrest) احتیاطا" ضمانت کے طور پر آئی ہے۔

کتابوں میں میری اور عزیز کی پسند بھی خاصی ملتی جلتی تھی۔ ہمیشہ گاؤں جانے سے آدھ گھنٹہ پہلے میرے آگے پیچھے گھومتا تھا' اور کہتا تھا کہ فلاں کتاب دے دو' گاؤں پڑھتا ہوا جاؤں گا پھر یاد سے واپس لے آؤں گا۔

ظاہر ہے میں کورا جواب دیتی تھی پھر تو عزیز ایک پر' اور میں' دوسری پر' جب تک بات جاکے امی کے کانوں تک نہ پہنچتی۔ کبھی عزیز کو ڈانٹ پڑتی اور کبھی مجھے۔

مگر زیادہ تر امی بیچ میں پڑ کر کتاب اسے لے کر دیتی تھیں۔ اس وعدے پر کہ فلاں دن تک بہ حفاظت واپس کی جائے گی۔اگر کوئی کتاب گھر میں نہ دیکھتی تو پھر تو مجھے یقین ہو جاتا تھا کہ ضرور یہ کتاب عزیز نے لی ہو گی' پھر میں کمر بستہ ہو کر اس سے لڑنے کے لئے تیار رہتی تھی۔ ادھر اس نے دروازہ سے سر نکالا ادھر میں چڑھ دوڑتی تھی ایک ہی سانس میں کہتی۔

"یزید کتاب لائے ہو۔" پوچھتا "کونسی کتاب؟" "وہی جو اس دن بغیر پوچھے لے گئے تھے۔" بغیر دیکھے میرے لہجے میں خواہ مخواہ کا اعتماد ہوتا تھا۔ اس بات پر عزیز قسمیں کھاتا تھا۔ کہتا تھا "سندھو ماں کی قسم" لیکن میں اس کی بات کاٹتی "مانو نہ مانو وہ کتاب تم نے ہی اڑائی ہے۔" کہتا تھا۔ "مولی علی......" مگر میرا آرڈر صفائی سے پہلے ہی نافذ ہو جاتا تھا۔ "دوبارہ آؤ تو کتاب لے آنا ورنہ میری طرف سے اپنی عزت کی خیر مناتا' تمہاری عزت ویسے بھی نہ ہونے کے برابر ہے اگر وہ بھی چلی گئی تو....." دھمکیاں سن کر پہلے قسموں کا سلسلہ شروع کرتا تھا۔ کہتا "حضرت عباس کی قسم مجھے نہیں معلوم۔" مگر ان قسموں پر تب تک یقین نہیں

کرتی تھی۔ جب تک' وہ کتاب اپنے کسی تکیے یا صوفے کے نیچے سے نہ نکال لوں۔ پھر کتاب کو اس طرح چھپا کر رکھتی کہ عزیز کی نظر نہ پڑے اس وجہ سے کہ آئندہ اگر واقعی کتاب لے کر جائے تو پھر اس پر رعب جما کر ڈانٹ سکوں۔

ان دنوں ہم رہتے تھے اپنے پرانے گھر میں۔ جس کے چار کمرے کھینچ تان کر ہم کو ہی پورے نہیں پڑتے تھے۔ بابا اور الطاف (میرا بھائی) ہیں ہمیشہ کے تنہائی پسند' اس لئے نہ وہ کسی کے کام میں دخل اندازی کرتے اور نہ ہی کوئی دوسرا ان کے کمروں میں جانے کی ہمت کرتا تھا۔

باقی رہے میں اور امی۔ اس لئے' عزیز آتا تھا تو زیادہ تر امی کے کمرے میں رہتا تھا۔ دن کو جھولے میں سکڑا ہوا' تکیہ موڑے لیٹا رہتا تھا اور رات کو سوتا تھا امی کے پلنگ پر۔ جتنی راتیں عزیز ہمارے ہاں ہوتا تھا.... وہ سب راتیں امی نیچے زمین پر سوتی تھی اور یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے بہت غصہ آتا تھا۔ امی مجھے دیکھ کر کسی نہ کسی بہانے دن میں ایک آدھ بار ضرور کہتی تھیں زمین پر کبھی کبھی سونا بہت لطف دیتا ہے مگر مجھے معلوم تھا کہ زمین پر سونا کتنا لطیف ہوتا ہے۔ خاص کر کے بوڑھی ہڈیوں سے۔

"آخر امی آپ اسے منہ پر کیوں نہیں کہتی کہ آپ زمین پر سوئیں اور یہ لاٹ صاحب پلنگ پر سوئے۔ امی کہتی "مجھ سے ایسے نہیں ہوگا۔ جب مجھے زمین پر سونا خراب نہیں لگتا پھر خوامخواہ......"

مگر امی کو عزیز کی دوسری باتیں دکھ پہنچاتی تھیں وہ تھا ہمیشہ کا "دھریہ" کرتا تھا' الٹی سیدھی باتیں۔ ساتھ بیٹھ کر ادب سے کوئی بات کرنا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی کو ہاتھ مار مار کر ایسا بیزار کرتا کہ میں سنجیدگی سے پوچھتی تھی کہ "عزیز!! کہیں پچھلے جنم میں تم نے بینڈ ماسٹری تو نہیں کی؟"

ایک جگہ بیٹھ کر بھی اتنا ہلتا جلتا تھا کہ ہنسی ہنسی میں اس کو مشورۃ" کہہ دیتی تھی کہ "بس بھائی اگر ان Random Activities کو تھوڑا بھی Arrange کر لو تو بینڈ ماسٹر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے ڈانس ماسٹر بھی بن سکتے ہو' اور اپنے خاندان کا نام بھی اونچا کر سکتے ہو۔ باقی بچوں کو پڑھانے والی ماسٹری میں کیا رکھا ہے؟"

امی چڑتی تھیں اس کے دھریہ پن اور اس کی الٹی سیدھی باتوں پر

ایک دفعہ باتھ روم میں گیا تو کچھ دیر کے بعد وہاں سے چیخنے چلانے لگا.....اتنا شور مچایا کہ امی آدھا گوندھا ہوا آٹا چھوڑ کر باتھ روم کے دروازے پر جا کر کھڑی ہو گئیں اور بے چین ہو کر پوچھنے لگی...."کیا ہوا؟ عزیز کیا ہوا!!؟" اندر سے جواب دیا "کچھ نہیں بس گرمی لگ رہی ہے۔" امی کہنے لگیں۔ "نالائق اس بات پر اتنا چیخ رہے ہو میں سمجھی تھی کہ -----۔" کہنے لگا "دراصل اس لئے چیخ رہا تھا کہ یہاں خیال آیا تھا کہ جب نیا مکان بنوائیں تو باتھ روم میں پنکھے لگوانا نہ بھولیے گا......یہاں بہت گرمی ہوتی ہے۔" پھر جب تک باہر آتا..... تب تک یہ بات بھول جاتا!!!

جب باہر نکلا تو میں نے اسے کہا "عزیز! تمہارے فکر اور تدبر کی پرواز باتھ روم سے شروع ہو کر پھر وہیں دم توڑ دیتی ہے۔ واہ واہ!! کیا خیالوں کی اڑان ہے؟"

اس پر عزیز نے ایک بڑا لیکچر امی کے سامنے دیا جس کا مطلب یہ تھا Sex سے لے کر Soul تک' سوچ کا پہلا سیمنار باتھ روم میں ہے۔" اس کی وضاحت کرتے ہوئے ایسی باتیں بھی کہہ گیا' جس پر امی بگڑ گئیں اور اسے بے نقط سناتے ہوئے کہنے لگیں "کم بخت اللہ اور رسول کے دھتکارے ہوئے چھوکرے دیکھو کفر بک بک کر تیرے منہ کی رونق بھی ختم ہو گئی ہے لگتا ہے کہ .... تمہارے آنے سے گھر میں رحمت ہی نہیں آئے گی۔ کم بخت بے شرم!!"

اس بات پر عزیز جاتے جاتے کہتا گیا۔ "خدا اور رسول کا نوازہ ہوا نہیں ہوں۔ امی! (بمن) منہ کی رونق تو فیرا ذال (ایک دوائی) کی نظر ہو گئی ہے۔ تنخواہ پوری نہیں ہوتی اس لئے-------"

اور جب عزیز امی کی لعنت ملامت سن کر جاتا تو ہمیشہ امی آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتی تھیں کہ "لعنت ملامت کرتی ہوں تو دل جلتا ہے' مگر اس کے کام ہی ایسے ہیں۔ دیکھ رہی ہوں کہ کمزور بھی بہت ہو گیا ہے جب پیدا ہوا تھا تو بابا اس کے پاؤں آنکھوں پر رکھ کر کہتے تھے کہ "یہ میرا کعبہ ہے۔"

قرض لینے کے لئے مجھے بھی طرح طرح سے قائل کرتا تھا سو دو سو تنخواہ' جس سے ہوٹل کا بل ادا کروں' دھوبی کی دھلائی دوں' تین وقت کھانے کے پیسے نکالتا ہوں اور شیو کا سامان لیتا ہوں دو تین فلمیں دیکھتا ہوں۔

میں وہ سارا پروگرام سن کر پیسے نہ دینے کا بہانہ کرتے ہوئے کہتی تھی "بھلا' کیا فلم دیکھنا خوامخواہ کا فرض ہے؟" کہتا "اپنے دل کے بھی خود پر کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ آخر تم کو کیا پتہ؟ فلم دیکھنا فرسٹیشن سے فرار کا سب سے سستا نسخہ ہے۔ انسان اپنے آپ کو بہلانے کے لئے پتہ نہیں کیا کیا جتن کرتا ہے۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی' جب کھانا پیٹ بھر کر ملتا ہو اور جوتے کم ہوں تو فرسٹیشن بوجھ بن جاتی ہے۔"

میں کہنے کو تو کہہ گئی مگر دل میں خود پر ہی ہنس پڑی۔ یوں ہنستا ہوا دیکھ کر کہنے لگا "پرگرام سارا تمہارے سامنے ہے تم بتاؤ کہ کونسا آئٹم زیادہ یا فضول ہے جو نکال دوں۔"

میں اسے مشورہ دینے کے لئے واقعی سوچنے لگی کہ کونسے زیادہ آئٹم کم کر کے اس کو تنخواہ بچانے کا مشورہ دوں کہ آئندہ وہ قرض لینے سے بچ جائے.....

"کیا فلم کا پرگرام کاٹ کر دل بہلانے کو رہنے دیتا' کھانے کے تین اوقات کو کم کر کے دو رہنے دیتا' یا دھوبی سے کپڑے دھلوانا چھوڑ دیتا' تو مجنوں بن کر سڑک پر نکل آتا۔ ان Items میں کون سا Items زیادہ تھا آخر؟" تب میں سمجھ ہی نہیں سکی تھی سوائے اس بات کے کہ عزیز کی جان پر سفید پوشی کا بھرم بھی اتنا وبال جان بنا ہوا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عزیز ہمیشہ وعدے کا سچا رہا تھا' ادھر تنخواہ ملی ادھر ٹیکسی کھڑی کر کے پہلے قرض ادا کر کے پھر گاؤں جاتا تھا۔ میں دروازے پر ٹیکسی کھڑی دیکھتی تو جان بوجھ کر کہتی تھی "ٹیکسی کھڑی ہے عزیز ورنہ تمہیں بڑے شاندار چاول کھلاتی۔"

کھانے کا تھا بڑا شوقین۔ ابھی گھر میں داخل ہی ہوتا' تو ایک نظر سامنے کچن میں ڈال کر اسی سے پوچھتا تھا "ادی! ہے کوئی چیز کھانے کے لئے یا......" میں' بیچ میں لقمہ دیتی "بالکل کچھ نہیں ہے۔"

خیر چاول کا سن کر چہرے پر سوچ کر لکیریں نمودار ہونے لگتیں۔ کہتا تھا "پھر ٹیکسی والے کو زیادہ دیر تک انتظار کرواؤں؟" ہاں اگر مہنگا نہ لگے تو۔" پھر گرم گرم نوالے منہ میں ڈالتا بھی جاتا تھا اور واہ واہ بھی کرتا جاتا تھا۔ جاتے جاتے کہتا جاتا "واقعی گھر کی روٹی اور پانی میں کسی معراج کا مزا ہے مگر ہمارے جیسے بدنصیبوں کو تو معراج ملتی ہی نہیں ہے۔"

ایک دفعہ دور سے ہی ایک بڑا سارا صندوق کھینچتا ہوا آیا اور کہا "پنجنگ میں R.T کو لازمی کیا ہے۔ اس لئے آیا ہوں ..... R.T کرنے' مگر رہوں گا آپ کے پاس کیونکہ نہ تو ہاسٹل میں داخلہ ملے گا اور نہ اپنے حالات ہی اجازت دیتے ہیں۔" یہ بات سنتے ہی میں چونکی' خود بھی تاڑ گیا' کہنے لگا "شکر کرو تم اس آزار سے بچ گئیں' ورنہ بارہ مہینے میری طرح ناک رگڑنی پڑتی۔"

میں نے جل کر کہا۔

"خیر ناک تو اب بارہ مہینے مجھے رگڑنا ہوگی' تم تو آخر میں سرٹیفکیٹ حاصل کر لو گے' مگر مجھے تو کچھ بھی نہیں ملے گا۔"

بات کو سمجھ گیا' کہنے لگا۔

"نہیں میں خوامخواہ آپ لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں دوں گا۔ زیادہ عرصے کے لئے رہنا ہے۔"

میں نے کہا۔

"تم جو تکلیف نہ کرو وہ ہمیں کرنی پڑتی ہے۔ نلکہ کھولو' تو بند کرنا بھول جاؤ' گھر میں سگریٹ کے ٹوٹے ڈھونڈنے کے لئے آدھی رات کو ساری بتیاں جلا کر سب کی نیندیں حرام کرو' ایڑیاں بجا بجا کر ڈراؤ۔۔۔"

بولا۔ "نہیں' نہیں' آئندہ ضرور احتیاط کروں گا۔ بس بھائی وعدہ......"

"یہ دیکھو دیوار پر لگے ہوئے نشان' تیل سے تر کشن' مڑے ہوئے تکیے' قالین پر کیچڑ کے نشان' یہ سب تمہاری بے ڈھنگی روش کے ثبوت ہی تو ہیں۔"

میں نے باتوں باتوں میں احتیاط" اس کی بے ڈھنگی روش پر نوٹس دے دیا تھا کہ کم از کم یا تو خیال کر کے رہے یا چلا جائے۔

پھر عزیز ہمارے یہاں رہنے لگا تھا۔ کچھ اس نے سمجھ سے کام لیا اور کچھ ہم نے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اس طرح لڑتے جھگڑتے' ہنستے ہنساتے' سنتے سناتے' وقت گزرتا گیا۔ کچھ نہ کچھ تو اب بھی ایک دوسرے کو کہہ ہی دیتے تھے۔ الفاظ کی جنگ میں اکثر تلخی بھی ہو جاتی تھی۔ ان وقتوں میں میرے نظریے بھی نرالے ہوتے تھے اور عزیز کو بھی ہمارے پاس رہنا تھا۔ اس لئے چھوٹے چھوٹے لفظی چکروں کو ایک دوسرے کی انا کا سوال بنائے رکھتے تھے' کیونکہ اس وقت میرا خیال تھا کہ ہم سب لفظوں کے بنے ہوئے ہیں۔ اوپر سے صحیح

سالم' اندر سے ٹوٹے ہوئے ہیں تو کیا ہوا۔ بہرحال یہ طے تھا کہ ایک دوسرے سے مات نہیں کھانی ہے۔ عزیز اپنے آپکو من سمجھتا تھا اور اگر میں سوا من نہ بنتی تو مزہ ہی کیا؟

دراصل مجھے ہوتا تھا اپنے Ego کا بہت خیال اور اس Ego کی حفاظت میں اگر کبھی کبھی الفاظ کی گرمی بڑھ جاتی تھی تو Sorry کرنا بھی تو آخر عام آدمی کے بس میں نہیں ہوتا !!!

کبھی کبھی امی کے پاس آکر بیٹھتی تھی تو کہتی تھیں کہ " تمھاری عزیز سے روز روز کی لڑائی مجھے اچھی نہیں لگتی۔ لڑنے جھگڑنے سے مٹکوں کا پانی بھی سوکھ جاتا ہے اسطرح۔ پتہ ہے جب تم چھوٹی تھیں تو تمہارے لئے ہم نے کبھی بھی کھلونے نہیں خریدے اور نہ گرم کپڑے۔ بابا مرحوم جب بھی حیدر آباد آتے تھے تو عزیز کے خریدے ہوئے سامان سے اتنا کچھ تمہارے لئے دے جاتے تھے' کہ آج تک تمہارے کھلونے اور گرم سوئیٹر سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔"

میں امی کا یہ بلیک میل کرنے والا موڈ سمجھ جاتی تھی۔ فوراً اس موضوع سے ہٹ کر عزیز کو موضوع بنا کر کہتی "امی یہ تو آپ بھی سمجھتی ہیں کہ وہ ہے بہت ہی بے ڈھنگا۔ اس پر نہ تو گھر کا اثر آیا نہ خاندان کا آخر گیا کس پر ہے؟"

امی نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا "گھر میں اور تو کوئی بچا ہی نہیں ہے یہ بیچارہ اثر کس کا لیتا! بچپن میں ہی باپ چلا گیا' چھوٹا تھا تو بابا اس کے پیروں پر آنکھیں......"

میں کہتی تھی۔ "مگر امی ہے بالکل اللہ میاں کی گائے آپ خوامخواہ رنجیدہ ہو جاتی ہیں۔"

کہنے لگیں۔ "تم اس کو ڈانٹتی ہو تو میرا دل دکھتا ہے۔"

".....اور میری جو بے عزتی کرتا اور دل جلاتا ہے وہ....."

"عزیز اور تیری بے عزتی کرے گا؟ ناممکن وہ تم سے تو بہت گھبراتا ہے ......"

"پتہ ہے امی' ابھی کل ہی اس نے مجھ سے جھگڑا کیا ہے۔ کل شام میری سہیلیاں آئیں تو' بیسوں چکر کاٹے' باربار مجھ سے پوچھتا تھا کہ "یہ کہاں سے آئیں ہیں؟ باپ اور بھائی کیا کرتے ہیں ان کے؟ پرفیوم کونسا استعمال کرتی ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔"

امی کہنے لگیں "بہت شریر ہے تم ہی منع کر دیتیں نا اسے۔"

"منع کیا تھا۔ مگر پتہ ہے مجھے کیا کہا.....؟"

امی نے بیچ میں بات کاٹ کر کہا۔ "پہلے یہ بتاؤ تم نے منع کس طرح کیا تھا؟"

میں نے بتایا۔ "خالی ڈھول' تمہاری پہنچ سے بہت دور ہیں' یہ پرفیوم۔ تم ہو ہی خالی کارتوس۔"

اس پر اس نے مجھے جواب دیا تھا کہ۔ "پہنچ تو تمہاری بھی نہیں ہوتی' مگر شکر کرو کہ تم حیدر آباد میں پیدا ہوئی ہو اور اگر پیدا ہوتیں گاؤں کے کسی غریب گھر میں' تو تم بھی آج اوپلے تھاپ رہی ہوتیں یا ازار بند بن رہی ہوتیں۔"

.....ابھی فجر کا وقت ہوتا تو عزیز کو چائے کی طلب ستاتی تھی۔ تھا تو سدا کا بھلکڑ' اس لئے یاد نہیں

ہوتا تھا کہ سوتے وقت جوتے کہاں اتارے۔ صبح سویرے اٹھ کر ہمارے خوف سے امی سے سرگوشی میں پوچھتا۔

"امی! میرے جوتے دیکھے ہیں؟ پتہ نہیں کہاں اتارے تھے۔؟"

کئی دفعہ وہ جوتے میرے سرہانے اتار دیتا تھا۔ اس پر میں اسے ایک دوبار ٹوکا بھی تھا۔ "جہاں سوتے ہو' وہیں پٹخا کرو اپنے جوتے میرے سرہانے پٹختے ہو' تو ساری رات مجھے ڈراؤنے خواب آتے رہتے ہیں۔"

حاضر جواب بھی بڑا تھا۔ فوراً کہہ دیا تھا کہ "خراب ذہنوں کو خراب خواب ہی نظر آتے ہیں۔ فرائیڈ کہتا ہے کہ۔۔۔۔۔"

میں نے جل کر جواب دیا کہ "مجھے چھوڑ کر فرائیڈ داڑھی والے نے تم سے یہ باتیں کب کہیں۔"

بولا۔ "وہ جو گلاس کے ذریعہ روح بلاتے ہیں نا' اس وقت میں نے بھی اس سے بات چیت کی تھی۔"

میں نے پوچھا۔ "پہلے وہ آیا بھی تھا؟"

بولا "وہ۔۔۔۔ کانے دجال کی طرح' اسی وقت حاضر ہوا تھا۔"

"تو پھر اس نے قوم کے نام کیا پیغام دیا تھا۔" میں نے شرارتاً پوچھا۔

بولا "قوم کے لئے تو فقط خوابوں کی تشریح کر گیا مگر تمہاری اس نے اچھی خاصی مٹی پلید کی تھی۔"

"کچھ اپنی قسمت کے بارے میں بھی پوچھا ہوتا؟"

"ہاں پوچھا تھا مگر اس نے کہا کہ تم جیسے اللہ والوں کی جوتیاں' فرشتوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں۔ باقی میں صرف انسانوں کے کچے چٹھے سناتا ہوں اور پھر۔۔ جاتے جاتے تمہارے لئے کہہ گیا کہ میں صرف اس کا پوتا ہوں' باقی وہ تو میری بھی دادی ہے۔"

تو میں بات کر رہی تھی کہ عزیز کو فجر کے وقت چائے کی طلب ہوتی تھی اور سرگوشی میں امی سے پوچھتا تھا.....جوتے کا۔ تو ایک دفعہ وہ سرگوشی میرے کانوں میں بھی پڑ گئی۔ اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر جان بوجھ کر پوچھا۔

"کیا ہوا ہے عزیز؟"

"میرے جوتے پتہ نہیں کہاں گئے؟ وہاں تو نہیں ہیں؟"

میں نے وہیں سے چلا کر اشارے سے کہا "ہاں ہاں خوب....بھگو کر رکھے ہیں میں نے' میرے کمرے میں آؤ....آ کے لے جاؤ..... یہ کہہ کر میں تو جا کر سو گئی' مگر صبح کو اٹھی تو دیکھا کہ امی کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ کچن میں گھسی تو عزیز وہاں سپ سپ کر کے چائے پی رہا تھا۔

میں نے بھی امی سے چائے مانگی' تو انہوں نے مجھے دینے کی بجائے میرے آگے پٹخ دی اور خود دوسرے کاموں میں لگ گئیں۔ مجھے جلدی ہی اپنے فجر والا جواب ذہن میں کھٹکنے لگا۔ اس لئے میں بھی چپ

چاپ بیٹھی رہی' مگر امی سے زیادہ برداشت نہیں ہو سکا۔
اس لئے کہنے لگیں۔
"دنیا جہاں کی بیٹیاں پڑھتی ہیں تو اس کے ساتھ کچھ حاصل بھی کرتی ہیں۔ ایک تم.....؟"
"کیوں۔ میں نے کیا کیا امی؟"
غصے سے کہنے لگیں۔
"یہ کوئی جواب دینے کا ڈھنگ تھا۔ فجر کے وقت لوگ الحمد اللہ کا نام لیتے ہیں اور تم....."
"مگر وہ بات تو میرے اور عزیز کے بیچ میں تھی امی.....اور ہم آپس میں......."
عزیز کو چپ دیکھ کر میں نے اپنی پالیسی کو تھوڑا بدلا' مگر امی بھی چھوڑنے والوں میں سے نہیں تھیں۔ اس لئے کہنے لگیں۔
"چاہے کسی کے بھی بیچ ہو' مگر پھن بھی آخر کوئی چیز ہوتے ہیں نا؟"
عزیز نے جھٹ موقع سے فائدہ اٹھایا اس لئے کہنے لگا۔
"امی انگریزی کا ایک قول ہے کہ......"
مجھے یقین تھا کہ وہ قول میرے فائدے میں نہیں ہو گا' بلکہ آگ پر تیل کا کام کرے گا۔ اس لئے فوراً بات کاٹ کر کہا "اچھا اچھا! دیکھو چائے میں مکھی نہ پڑ جائے۔" مگر عزیز کو یقین تھا کہ صبح کے وقت کچن میں مکھی کا گزر نہیں ہو گا۔ اس لئے بڑے اطمینان سے وہ قول سنا کر ہی دم لیا۔
کہنے لگا "انگریزی قول ہے کہ جس کی دولت گئی اس کا کچھ نہ گیا۔ جس کی صحت گئی تو سمجھو کہ اس کا کچھ کھو گیا اور جس کے پھن گئے تو سمجھو کہ اس کا سب کچھ چھن گیا ہے۔"
یہ سن کر میں چڑ گئی اور چمچہ اٹھا کر کہا کہ۔
"دیکھو عزیز' اپنے آپ پر قابو رکھو ورنہ.....؟"
مگر امی کے کانوں میں میرے سب کچھ چھن جانے کی اطلاع پہنچ گئی تھی۔ اس لئے سب کچھ چھن جانے پر اتنا ماتم مچایا کہ میرا وہاں سے چپ چاپ کھسک جانے کے سوا' کوئی چارہ ہی نہیں رہا۔
کہنے لگیں۔ "ہاں سچ سچ سب کچھ چھن گیا ہے تمہارا۔۔۔۔ دنیا کی بیٹیاں دیکھتی ہوں تو کلیجے میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔۔۔۔ لیکن ایک یہ ہے کہ۔۔۔۔۔"
یہ سن کر مجھے عزیز پر اور زیادہ غصہ آیا۔ اس لئے جل کر پاس سے گزرتے ہوئے بڑبڑاتے میں نے عزیز سے کہا۔۔۔۔
"پیڑ کے سوکھے ہوئے چھلے اگر بدلہ نہ لیا تو میں بھی میں نہیں۔"
اس دن سیڑھیاں اترتے ہوئے سوچتی گئی کہ کم بخت کو دیکھو تو کہ امی کو کیسے بھڑکایا۔ آج دوپہر کو واپس آکر اگر امی کا موڈ ٹھیک رہا اور وہ بھی میری زد میں آیا' تو ایسا ذلیل کروں گی کہ یاد کرے گا۔۔۔۔۔۔
ایک دفعہ بابا گاؤں گئے ہوئے تھے۔ امی اوپر مغرب کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ اس لئے موقعہ پا کر میں

نے عزیز سے کہا کہ۔

"عزیز! اگر ساتھ دو تو میں، تم اور الطاف آج کی شام شاندار طریقے سے منائیں۔"

پوچھنے لگا۔۔۔۔

"کیسے؟"

میں نے کہا کہ۔

"ٹی وی دیکھیں گے، چائے پئیں گے اور تمہاری پتے کی بیڑیاں پئیں گے۔" یہ سن کر اس نے بھی حامی بھر لی۔

اور..... تینوں کی منظوری سے ہم جا کر ڈرائنگ روم کے فرش پر بیٹھے۔ میں احتیاطاً کمرے کے پردے اچھی طرح گرا دیئے تھے تاکہ پتے کی بیڑیوں کا کڑوا دھواں یا بدبو باہر نہ نکلے۔

پہلے عزیز نے بیڑی سلگائی۔ دو کش لگا کر مجھے دی۔ میں نے بیڑی کی دم توڑ کر، دو کش لگا کر الطاف کو دی اور الطاف نے عزیز کو دی۔ اس طرح دو راؤنڈ پورے کر کے پھر نئی بیڑی سلگائی، مگر بیچ میں عزیز نے بیچ کہا کہ۔ "اس طرح بیڑیوں کی دم توڑ توڑ کر پیتی رہی تو میرا تم کباڑہ کرو گی، اگر پینی ہے تو ساری بیڑی پیو نہیں تو آپ کی مرضی۔"

میں نے کہا۔ "بھئی دیکھو۔ پئیں گے اس طرح، جس طرح ابھی پی رہے تھے۔ باقی تم پر بوجھ نہیں پڑنے دیں گے۔ جتنی بیڑیاں پئیں گے۔ اتنے پیسے گن کر لے لینا۔ بے شک دو پیسے فی بیڑی زیادہ لے لینا۔"

بولا "پیسوں کی بات نہیں ہے، لیکن اگر رات کو ختم ہو گئیں تو میرا تو ایک پل بھی ان کے بغیر نہیں گذرتا اور پھر نوٹے ڈھونڈتا تو۔۔۔۔۔" جب بیڑی کا تیسرا راؤنڈ پورا ہوا تو پتہ چلا کہ مذاق ہی مذاق میں ہماری بے خیالی سے کوئی چنگاری قالین کے نرم نرم اون کے اندر ہی اندر سلگ کر ایک گلابی پھول کلیوں سمیت جلا کر بھسم کر چکی ہے۔ تفریح کا موڈ تو غارت ہو گیا۔ جلدی جلدی جلتے ہوئے قالین پر پانی ڈال کر ڈالا لیکن بجھانے اور چھپانے کے چکر میں امی کو پتہ چل ہی گیا۔ بیڑی پینے کی خطا تو شاید معاف ہی کر دیتیں لیکن قالین کا جلنا معاف نہیں کر سکیں۔ مزید جو یہ پتہ چلا کہ میں نے اور الطاف نے بھی بیڑیاں پی ہیں، تو ہم دونوں کو وہ ذلیل کیا کہ ہم دونوں تو چپ چاپ جا کر بستروں میں دبک گئے۔ باقی رات گئے تک عزیز کو وہ بے نقط سنائیں کہ آج بھی یاد ہیں۔ امی نے کہا تھا۔

"بانٹلوں کے پلے ہوئے کافر، تم گھر میں رہنے کے لائق نہیں ہو۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو لیکن پھر بھی یہ کتوں جیسی عادتیں چھوڑتے نہیں ہو۔ توبہ میری! سارا قالین جلا دیا ہے اور بیڑیاں بھی پلائی ہیں۔ اتنا قیمتی قالین جلا ہے کہ اس کا یہ داغ کبھی بھی نہیں بھولوں گی۔" اس ساری رات امی نے آتے جاتے قالین کا جلا ہوا داغ دیکھ کر ہم پر لعن طعن کیا تھا.....

اسطرح دن، بہت ہلکے پھلکے ہو کر گذرتے گئے اور عزیز دل لگا کر بی ایڈ مکمل کرتا رہا۔ اگر یہ کہوں کہ بی ایڈ، عزیز کو لگن سے کرتی رہی تو درست ہو گا، کیونکہ لگ رہا تھا کہ اس پر یونیورسٹی کی ٹاپ کا نشہ کا

خوشگوار اثر ہونے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک آگئی تھی اور چہرے سے سرخی بھی چھلکنے لگی تھی۔

عزیز کا اس طرح دھیرے دھیرے اور رومینٹک گیت گنگنانا۔ ژانٹ ڈپٹ سن کر بھی میرا پرفیوم لگانا۔ مجھے بے سبب نہیں لگے تھے۔ چینٹ کو پانچ دفعہ استری کر کے کاندھوں پر اجرک لپیٹ کر پوچھتا تھا۔

"بھلا کیسا لگ رہا ہوں؟"

میں چینٹ اور اجرک کے تضاد کو تنقیدی نظروں سے دیکھ کر کہتی تھی "دھڑ بھیڑ کا اور گردن بکری کی اور اوپر سے پوچھتے ہو کیسا لگ رہا ہوں۔" مگر اب یہ چھوٹی باتیں اس پر اثر نہیں کرتی تھیں ہلکی ہلکی آواز میں ایک سندھی شعر گنگناتا تھا جس کا مطلب تھا کہ۔

"دل میرا غموں سے ٹوٹ رہا ہے۔"

میں اس کو موقع پر پکڑ لیتی اور ٹوکتی کہ۔

"عزیز تم چھ فٹ کے جوان ہو کر گنگناتے رہتے ہو زنانہ گیت! تمہارے منہ پر جچتا ہی نہیں' اس سے تو بیٹھ کر قومی نغمے گاؤ۔"

کہنے لگا۔ "تم سے مشورہ کس نے لیا تھا کہ کیا جچ رہا ہے چہرے پر اور کیا نہیں جچ رہا۔"

میں نے کہا۔ "جو بات مناسب سمجھی' تو اچھائی سمجھ کر سامنے رکھ دی' نہ مانو تو نہ سہی۔"

طنز سے جواب دیا۔

"تم اور اچھائی' اس چھوٹے سے قد سے اچھائی کرو گی تو وہ یہ جنم نہ ہو گا۔"

میں بولی "نہیں ایسا بھی نہیں' میں تو بہ نفس نفیس اچھائی ہوں۔"

بولا۔ "تم اگر کسی فقیر کے تکئے کے پاس یا مائی خیری کی مسجد سے متاثر ہو کر کوئی اور جگہ مسجد تعمیر کراؤ گی۔۔۔۔ تو بھی میں سمجھوں گا کہ تم نے یہ مسجد ضرور جوتیاں چرانے کے لئے۔۔۔۔۔"

یہ سن کر میں نے اس کی آنے والی نسل پر زور سے لعنت بھیجی۔۔۔۔۔ اور آئندہ اس کو کوئی بھی مشورہ نہ دینے کا پکا ارادہ کر لیا۔ یہ بھی کوئی تک ہے!! اچھائی بھی کرو اور چور بھی بنو۔ بھلا یہ کیسا دستور ہوا؟

وہ ایک دن گھر آیا تو خلاف معمول چپ چپ اور الجھا الجھا سا لگ رہا تھا۔ جوتے ایک کونے میں اتار کر رکھے اور فوراً آکر کچن کے دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھ گیا۔ میں وہاں امی کے لئے مونگ کی دال ابال رہی تھی' کیونکہ ان کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔

وہ صبح سے چادر تانے لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کو دال دینے گئی' تو کہنے لگیں۔

"عزیز! کیوں آج خاموش سا لگ رہا ہے' پوچھو تو سہی؟"

لیکن مجھے امی کا وہ لفظ خاموش سا اچھا نہیں لگا۔ اس لئے امی کا نام لے کر۔۔۔۔ اپنی طرف سے پوچھا۔

"عزیز امی پوچھ رہی ہیں کہ آج بھیگی بلی کیوں بنے ہوئے ہو؟"
لیکن آج وہ موڈ میں نہیں تھا اس لئے نہ تو چڑا نہ کچھ بولا۔
میں نے چائے کے دو کپ بنا کر ایک خود رکھا دوسرا اس کو دیتے ہوئے پوچھا۔
"تمہارے کلاسز کیسے چل رہے ہیں۔" وہ تھوڑا چونک سا گیا اور پوچھا۔
"کیوں"
میں بولی۔ "ویسے ہی۔"
ہلکا سا مسکرایا مگر فوراً سنجیدہ ہو کر کہا۔ "خیر تو ہے؟"
پرانے خط کا روایتی جملہ دہراتے ہوئے کہا۔
"یہاں سب خیریت ہے باقی آپ کی طرف خیریت نہیں لگ رہی ہے۔"
بولا۔ "اگر پھسکا لاجی (سائیکولوجی) کے رعب میں لانا چاہ رہی ہو تو ایسی کوئی بات نہیں۔"
"کچھ بتاؤ یا نہ بتاؤ باقی------"
مگر دیکھا عزیز ایک دفعہ پھر خیالوں میں گم ہو گیا یوں محسوس ہوا جیسے چائے کی بھاپ میں اس کے خیالات امل رہے ہوں اس لئے ایک دفعہ پھر پوچھا۔
"عزیز انسان ہونے کی وجہ سے سیدھا چل چل کر آدمی کبھی پٹڑی سے اتر بھی جاتا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔"
کہنے لگا۔ "دیکھو پھر وہ کتابی Language"
"کتابی باتیں کتابوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ وہ صرف پڑھنے کے لئے ہوتی ہیں یہاں صرف تم اور میں بیٹھے ہیں بتاؤ کوئی خاص بات ضرور ہے؟"
بولا "کچھ بھی تو نہیں ہے۔"
لیکن مجھے یقین کیسے آتا اس لئے میں اڑی رہی کہ۔
"تم چلتے چلتے ضرور پٹڑی سے اترے ہو۔ مجھے یقین ہے۔"
بولا۔ "پٹڑی چھوٹ جانے کے ڈر سے میں کبھی پٹڑی پر چلا ہی نہیں ہوں۔"
"لیکن آدمی کی نجات تو صرف پٹڑی پر چلنے میں لکھی ہوئی ہے تاکہ وہ صحیح سالم چل سکے۔"
"تو پھر میں اپنی مرضی سے چلا ہی نہیں ہوں۔ مجھے زندگی میں زبردستی آگے دھکیل دھکیل کر لایا گیا ہے۔ میں نے زندگی گزاری نہیں ہے۔ مجھے گزارانی پڑی ہے------"
میں بولی۔
"یہ باتیں تو چوٹ کھا کر دل کے بہلانے کے بہانے لگ رہے ہیں۔ کیا مجھے واقعی کچھ نہیں بتاؤ گے-----؟"
"کہہ رہا ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے------"

"دیکھو عزیز ہم سب دھرتی کے رہنے والے ایک ہی خمیر کے بنے ہوتے ہیں۔ زمین پر رہ کر آسمان کی باتیں کرنا "زیب داستان" کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ مانو کہ اگر آج تمہاری پستیاں تم کو نیچے دھکیلنے کے لئے تیار ہیں تو یقین مانو کہ آسمان رفعتیں بھی تم کو اوپر لانے کے لئے ضرور کوشاں ہوں گی۔

بولا۔ "دیکھو پھر وہی پھسکا لوجی۔۔۔۔ باجرہ کا پیالہ دے کر ڈگری لینے والوں کا حال اور کیا ہو گا؟"

"پھسکا لوجی نے مجھے اور کچھ دیا یا نہیں۔۔۔۔۔ البتہ اتنی Broad Minded ضرور ہوئی ہوں کہ جو تمہاری کسی بات کو نہ تو نیا سمجھوں اور نہ ہی سن کر حیران ہو جاؤں۔"

"انسان کبھی تولہ کبھی ماشہ ہوتا ہی رہتا ہے اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے؟ پھیر تو کبھی کسی کثافت کا ہوتا ہے۔ انسان ہونے کے ناطے سب کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔"

بولا۔ "بے کار لیکچر دے کر سر مت کھاؤ' ایسی کوئی بات نہیں ہے.........."

"تو پھر چھپاتے کیوں ہو؟ بتا کیوں نہیں دیتے؟"

کہنے لگا۔ "بابا پھٹے ڈھول کا کیا اعتبار۔"

"اچھا! پھر وعدہ لو۔"

وعدہ لے کر عزیز نے مجھے ایک چھوٹی سی نازک سی بات بتائی۔۔۔۔ بات کوئی خاص نہیں تھی۔ بس تیری میری ایک عام سی کہانی تھی لیکن عزیز کا مان رکھنے کے لئے اس کا بھرم رکھا۔ نہ اس کی زندگی میں کسی سے ذکر کیا' نہ اپنی زندگی میں کسی سے کروں گی۔ باقی یہ بتا دوں کہ اس چھوٹی سی بات میں چاند کی سی چمک' پھولوں کی سی مہک بھی اور امیدوں کی آس بھی' تاروں کی چمک اور ہیروں کی دمک بھی تھی۔ اس بات میں ایک عام آدمی کی طرح۔۔۔۔۔ لیکن عزیز پتہ نہیں کیوں الجھا الجھا لگ رہا تھا؟

اور تب ایک عام راتوں کی طرح ایک رات تھی نہ تو تاروں کی نم نم تھی نہ ہی چاند میں کوئی خاص چمک تھی۔ گھور اندھیرا بھی نہیں تھا نہ بجلی کا کوئی کھٹکا تھا۔ بس عام راتوں کی طرح حیدر آباد کی ایک عام رات تھی۔

اس شام سارا وقت بیٹھ کر گھر کی Setting تبدیل کی تھی' قالین کو جھڑوایا' صوفہ اور کشن کے کور بھی بدلوائے تھے۔ بتیاں صاف کروا کے پردے تبدیل کئے تھے۔ چاول صاف کر کے پکانے کے لئے باہر رکھے تھے' کیونکہ آنے والی صبح کو چاولوں کی مہک کچن میں پھیلنی تھی' کیونکہ میرے لئے آنے والی صبح عید کی صبح تھی' اور اتنے کام کے بعد میں جو گہری نیند سو گئی تھی' گھنٹی کی گھن گرج نے مجھے ڈرا دیا تھا' لیکن میں نے اپنی طرف سے سوچا تھا کہ آیا ہو گا محلے کا کوئی بچہ' ماچس لینے کے لئے' یا پھر کوئی چھوٹی بچی آئی ہو گی' عید کی مہندی لگوانے' اس لئے خودغرض بن کر سوچا کہ بابا کی اتنی قیمتی نیند خراب ہو گی۔بچوں کا کیا ہے وقت بے وقت کھڑے رہتے ہیں۔ اس وقت "وقت" کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ اس معاملے میں ہمیشہ سے جاہل تھی اور ہوں۔

اس لئے اٹھ کر مین سوئچ بند کر دیا کہ "نہ ہو گی لائیٹ اور نہ بجے گھنٹی۔"

میں اپنے آپ کو داد دے کر دوبارہ لمبی تان کر سو گئی لیکن محسوس ہوا اب بھی کوئی ہے جو دروازہ بجا رہا ہے۔ چڑ میں اٹھ کر سوئچ آن کر کے راستے کی بتی جلا کر دروازہ کھولا۔ سامنے اشفاق' میرا خالہ زاد بھائی تھکا ہوا چہرہ اور بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔

"عزیز کا رات آٹھ بجے ٹرک کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ بہت Serious ہے' سول ہسپتال لے کر آئے ہیں۔" عزیز گیا تھا عید کی چھٹیاں گزارنے گاؤں میں اپنی اور میری دادی کے پاس

کانپتے کانپتے امی کو اٹھایا۔ ان کو بتایا کہ گاؤں سے اشفاق آیا ہے۔ عزیز کو چوٹ لگی ہے۔ اس لئے اسے یہاں لائے ہیں۔

امی جیسے تیسے کر کے اٹھ گئیں۔ "چوٹ عزیز کو لگی ہے' دل میرا کیوں بیٹھا جا رہا ہے؟"

تسلی دینے کی خاطر میں نے کہا "اللہ خیر کرے گا امی آپ اٹھیں تو سہی ہم اسپتال چلیں"

جب ہم گھر سے نکل رہے تھے تب موذن نے بھی اللہ اکبر کہا تھا "شگون اچھا ہے۔" امی کہنے لگیں۔

دل کو کچھ ڈھارس ہوئی۔

فجر کی اذان کے سائے میں ہم ہسپتال گئے راستے میں اشفاق نے بتایا کہ۔

"رات جب عزیز کو چوٹ لگی تو بظاہر اس کو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اسے ہسپتال لے گئے تو ڈاکٹر نے بھی یہی کہا کہ "کوئی خاص بات نہیں ہے۔ چار گھنٹوں کے بعد عزیز کی طبیعت بگڑنے لگی' یہاں لے کر آئے تو ڈاکٹر نے جواب دے دیا کہ اگر چار گھنٹے پہلے لے کر آتے تو امید بھی تھی۔"

سارے راستے امی دعائیں مانگتیں چلیں۔۔ بولیں۔

"اذان کے خالق' میرے باپ کے گھر کا دیا جلتا رہنے دینا' یا علی میرے بچوں کے صدقے میرے بچوں جیسے کو ہنستا کھیلتا رکھنا' اللہ میاں عزیز نے ابھی دنیا میں کچھ نہیں دیکھا۔۔۔۔۔۔۔"

اور جب ہم ہسپتال پہنچے تو امی بے چین ہو کر وارڈ میں گھس گئیں۔ البتہ میں دروازے پر کھڑی رہی' کیونکہ اندر جانے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اپنے آپ کو دلاسہ دے کر خود کو اندر لے گئی' لیکن اس دوران امی عزیز کے منہ پر سفید چادر تان رہی تھیں۔

انہوں نے مجھے دیکھ کر چادر ہٹاتے روندھی ہوئی آواز میں کہا "یہ دیکھو بیٹا' میرے بابا کا کعبہ کس طرح مسمار پڑا ہے۔" لیکن میں نے ان کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "خدا کے واسطے مجھے نہ دکھائیں۔ وہ کعبہ جس کو میں نے گرتا ہوا محسوس کیا ہے۔ امی مجھے نہ دکھائیں۔"

کیسے دیکھوں اس ٹوٹے ہوئے تارے کو۔۔۔۔ جوانپوری رچنا؟ اور گھائل جذبہ تھا۔ بکھری ہوئی آس اور ٹوٹا ہوا سپنا تھا۔ بھلا جیون کی یہ شکستگی بھی دیکھنے کی چیز تھی۔

ا۔ کھدائی چاول:۔ چاول کی ایک قسم جو صرف سندھ میں ہوتی ہے یہ چاول انتہائی لذیذ اور خوشبودار ہوتے ہیں۔

رشید بھٹی

کالے کا دسواں عشق اور کار

"کالے ذرا بتاؤ تو سہی کہ آخر تمہارا دسواں عشق کہاں تک پہنچا؟"

شیام ہرنائی نے توس کو وسکی میں ڈبوتے ہوئے انکشاف کیا۔

ہرنائی ہمیشہ وسکی میں توس ڈبوتا ہے۔ ایک دن اس کے ملازم کو کالے خان کی دوکان سے کباب لانے کے لئے کہا تو ہرنائی چیخ پڑا۔

"نہیں یار اس کے پاس گائے کے کباب ہوتے ہیں۔"

"آج تو میٹ لیس ڈے ہے۔ اندھے' مچھلی کے کباب ہوں گے۔"

مقبول اونٹ نے انگوٹھا چوستے ہوئے کہا۔

"مچھلی بھی بڑے کے گوشت کی ہوگی۔"

ہرنائی نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا اور آخر تک اسی بات پر اڑا رہا۔ آخر کار ہم نے کباب منگوائے اور اس نے توس۔۔۔

حنیف (کالا) کے بارے میں اور خاص کرکے اس کے عشق کے بارے میں انکشاف ہمیشہ ہرنائی کرتا ہے۔ اس بات کی ایک وجہ ہمسایہ ہونا اور دوسرے اس کے اندر ہرنائی کے عشق کے بارے میں کنسوئیاں لینے والی طبیعت کا بھی دخل ہے۔ کالے کا کسی صابن ساز کمپنی کو نوٹس دینے کا انکشاف بھی ہمارے سامنے ہرنائی نے ہی کیا تھا۔ اس بے چارے کے ساتھ ہوا بھی تو بہت برا تھا۔ اس صابن ساز کمپنی نے اپنے صابن کے ایک اشتہار میں کالے کی تصویر چھا دی تھی اور نیچے لکھا تھا۔ استعمال سے پہلے اور اس کا نیگیٹو (کالی کاپی) چھاپ کر لکھا تھا' استعمال کے بعد۔ اس سے پہلے کالے کے تیسرے عشق کو چھوڑ کر نویں تک کا انکشاف بھی اس نے ہی کیا تھا۔ تیسرا عشق کالے نے سندھ کے کسی ایسے نام والے گاؤں میں کیا تھا۔ جو "ٹمبکٹو اور ڈیلفن پھو" کی طرح بے معنی اور بے مقصد تھا اور تلفظ کرنا بھی مشکل تھا۔ اس کا آخری نویں عشق کا اختتام دوسرے آٹھ عشقوں کی طرح ناکامی اور دکھی تھا۔

وہ لڑکی مسز راج پال (حنیف کے چوتھے عشق والی ہیروئن) کی خالہ زاد کی پھوپھی زاد کی ماموں زاد کی چچا زاد کی بیٹی تھی۔ ان کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ کالے (حنیف) نے اس کے کرچن ہونے والی شرط بغیر سوچے سمجھے ٹھکرا دی۔ کالا ویسے تو یہ شرط نہ ٹھکراتا لیکن اس نے وہ شرط رمضان کے مہینے میں لگائی تھی۔

اس موسم میں حنیف (کالا) مذہبی جوش جذبے سے بھر جاتا ہے' پچھلے رمضان میں وہ ان جذبات کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے دو دانت مبارک بھی شہید کروا بیٹھا تھا۔ شامت اعمال سے اس کا گزر لیوکس پارک سے ہوا تو وہاں ایک پٹھان مزدور کیلا کھا رہا تھا۔ اب اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور جاکر اس مزدور کو گریبان سے پکڑ لیا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ اس کے دانت ایک چانٹے سے ٹوٹ جائیں گے' پھر بھی جوش تب جاکر ٹھنڈا ہوا' جب "نشاط" میں جاکر دو گلاس ٹھنڈے پانی کے پیئے' یہ کالے کا دسواں عشق تھا۔ اس کے نتیجے کا ہم آسانی سے فیصلہ کر سکتے تھے۔ ہوا وہی تھا جو چین سے اتحادی فوجیں کررہی تھیں۔ داخلہ سے نیا حرف! لیکن یار کی حالت یہ تھی ابھی آس ختم نہیں ہوئی تھی۔ اسی لئے "اونٹ" اسے بے حیا عاشق کہتا ہے۔ اس دن جب ہرنائی نے اس کے لئے عشق کا انکشاف کیا تو پہلے تو وہ ٹالتا رہا لیکن پانچویں پیگ کے بعد جب وہ موج میں آیا تو ہاتھوں اور پیروں سے میز اور فرش پر ڈھولک بجاتے ہوئے اپنی روایتی بے سری آواز میں گانا گانے لگا....... "ہائے رے میرے سنت کنور رام میرا دل توڑ دیا" محبت میں ڈوب کر وہ ہمیشہ یہی گنگناتا اور گاتا تھا۔ کہتا تھا "ہم وہی خنور سنت ہیں جو عشق ہی سے قابو میں آتے ہیں....." گاتا کیا ہے' اڑوس پڑوس کے گدھے کتے وہ جگہ ہی کچھ دیر کے لئے چھوڑ کر چلے جاتے ہوں گے۔ اس دن بھی جب پڑوسیوں کی نیند خراب کرتے کرتے تھک گیا اور آنکھوں میں آنسو آئے تو ہمارے آگے کھل گیا۔ اس دفعہ اس کا ٹارگٹ مقامی زنانہ ہسپتال کی ایک نومسلم نرس تھی۔ وہ بختاور خود کو صبیحہ کہلانے کا شرف حاصل کر چکی تھی۔ مشرف بااسلام ہونے سے پہلے' روہڑی میں پیرو کی اماں ہیمی کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ مسز شیام کی کسی دوست کی دور پار کی رشتہ دار تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کالا اس پر رقیب رو سفید ہونے کا ایک ہلکا سا شک بھی کرتا تھا۔ اس موقعے پر ہی حنیف نے خمار آلود ہوکر ہرنائی کی شکایت کی تھی۔

"یارو اس ہندو کو سمجھاؤ کہ وہ صبیحہ ہے۔ ہیمی نہیں ہے جو یہ اس کی طرف اپنے ناپاک ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ ارے شرم کرو ورنہ میں بھابھی کو شکایت کر.....!"

میں نے ہرنائی کو ڈانٹا۔

"دیکھو بھئی بھائی۔ تم ہی بتاؤ۔ اس نے جب بھابھی پر طبع آزمائی کی تھی ہم کوئی بیچ میں آئے تھے۔ اب بھی وہ ہماری بھابھی ہے۔"

کالے نے معصومیت اور عاجزی سے کہا "خدا اس کو سارے جگ کی بھابھی بنائے۔"

مقبول اونٹ نے ناک کی چوٹی مسلتے ہوئے کہا۔

"شیام کی بھی!"

میرے منہ سے نکل گیا۔ "اس عشق کی وجہ سے کالے میں سوائے جنس کے اور بہت ساری تبدیلیاں آگئی تھیں۔ اس کے عادات و اطوار اور رنگ ڈھنگ کافی حد تک بدل چکے تھے۔ پچھلی گرمیوں میں کالے کا رنگ' سلیٹی کالے بلیک بورڈ والا کالا رنگ ہوگیا تھا' اس کا سبب ہرنائی نے یہ بتایا تھا مس ہیمی کا گھر کالے کی بیٹھک کے سامنے ہے اور وہ بھری دوپہر کو تپتی ہوئی دھوپ میں باہر گیلری میں کرسی ڈال کر کتاب

پڑھتا تھا' اس طرح اس نے عشق کے ساتھ ساتھ خود کو بھی جاانا شروع کر دیا تھا۔ پہلے کرسی باہر نکلی پھر میز پھر الماری اور آخر میں منکا اور گھڑونچی بھی باہر نکلے۔ سردیوں میں تو رات کو وہاں آگ جلا کر بیٹھنے لگا تھا۔

دروغ برگردن ہرنائی!

اس عشق میں ہرنائی نے باقاعدگی سے کالے کو بلیک میل کرکے اسے لوٹنا شروع کر دیا۔ راز کی پردہ پوشی کرنے کے لئے وہ اس سے "بہت کچھ" لیتا اور کھاتا پیتا تھا۔ اس "بہت کچھ" میں فلم کا اسم عام تھا' دوسرا بقول شیام کے "کالا گھوڑا" تھا۔ کبھی کبھی جب کالے کی نیت حاتم کی روح کو تنگ کرنے کی ہوتی تھی' تو "کالے گھوڑے" کے بجائے "سفید گھوڑا" "کالا اور سفید" یا "کالا کتا" بھی بن جاتا تھا۔

اس دن والی پارٹی بھی کالے سے ہرنائی نے انہیں وجوہات کی بنا پر لی تھی۔ اس دفعہ بھی ساقی گیری کے فرائض کالے نے انجام دیئے تھے۔ "جس طرح تمہارا حال ہورہا ہے تو لگ رہا ہے کہ اگلے جہان میں بھی تم ہی ہماری ساقی گیری کرو گے۔" اونٹ نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔" اس نے بوتل کھولتے ہوئے کہا۔

"اگر وہاں بھی "کالا گھوڑا" ملا تو مر جائیں گے۔"

"اگر وہ "کالا" نہیں بھی ہوا تو تمہارے ہاتھ لگانے سے ہوجائے گا۔"

ہرنائی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا اور کالا چڑ گیا۔

اور پھر جب شیام نے بھی اس کا راز فاش کیا تو نشہ ہونے کے بعد اس نے ہرنائی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"آج تم مجھے الو بنا رہے ہو۔ میں تمہیں دیکھ لوں گا۔"

"بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ تو تم پہلے ہی سے بنے بنائے ہو۔"

شیام بھی لے میں آگیا تھا۔

معاملہ تو کیا' تو کیا' پر پہنچ گیا۔ میں نے اور "اونٹ" نے بیچ میں پڑ کر صلح کرائی۔ ہرنائی پر دو دفعہ پارٹی دینے کا جرمانہ ہوا کہ کالے کو اتنا لوٹنے کے باوجود اس نے اب تک کوئی پارٹی نہیں دی۔ بدلہ لینے کے لئے کالے نے بھی ہرنائی کے راز فاش کرنا شروع کر دیئے پھر پہلا راز اس نے یہ فاش کیا کہ ہرنائی جو پیلا سویٹر پہنے گھومتا ہے وہ دراصل بھابھی کا تھا اور وہ اس نے اس کو فرکوٹ لے کر دینے کے جھانسے میں لیا تھا۔ وہ راز کھلنے کے بعد ہرنائی نے پھر اس کو میرون رنگ دلوا دیا۔ دوسرے بھی اس نے کئی انکشاف کئے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ ہرنائی پینے کے بعد گھر جاکر آؤٹ ہوتا ہے اور میٹھے چنے اور ریوڑیاں کھاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

دروغ برگردن حنیف السیاہ۔

شروع میں ہمارے بہت کہنے اور منتیں کرنے کے باوجود بھی کالے نے ہمی کا تعارف ہم سے نہیں کرایا تھا۔ آخر قسمیں کھانے اور نیک نیتی کے وعدے کرکے اسے راضی کرلیا اور کالے اور ہمی کے ساتھ

ہم نے گاؤں میں پکنک کا پروگرام رکھا۔ اتوار کے دن گھر سے نکلے گاؤں جاتے ہوئے راستے میں ہماری اجنبیت ختم نہیں ہوئی لیکن وہاں پہنچ کر ہم کو کالے کی عزت کا پتہ چل گیا۔ وہ کالے سے اس طرح بات کررہی تھی جیسے مالک اپنے نوکر سے بات کرتا ہے' پورا وقت کالے نے اس کی خدمت اور دیکھ بھال میں گزار دیا۔ اس کی نوکری اٹھا کر اس کے پیچھے چلتا' ہاتھ پکڑ کر گڑھے پار کراتا اور اٹھتے وقت اس کی جوتی اٹھا کر پاؤں کے قریب رکھتا اس کی اچھی خاصی ورزش ہورہی تھی۔ وہ ذہانت میں کالے کے پاسنگ بھی نہیں تھی البتہ حسین تھی اور اتنی ہی مغرور بھی۔ واپسی پر مس ہمی نے مجھے ڈرائیونگ سکھانے کے لئے کہا جو میں نے شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کالے کا غصہ سہتے ہوئے قبول کیا۔

وہ تیسرے دن میرے ساتھ سبق لینے نکلی ہم دونوں سڑک پر جارہے تھے' وہاں اس نے عشق میں "اونٹ" کی طرح کروٹ لینے کی بھی کوشش کی لیکن میں خود پر قابو پائے ہوئے تھا۔ چوتھے دن جب میں اسے ہسپتال سے لینے گیا تو پتہ چلا کہ وہ کالے کے ساتھ کار میں چلی گئی ہے کیونکہ کالے نے مجھے رقیب روسیاہ سمجھ کر اس کی وہ خواہش پوری کرنے کے لئے رہی سہی رقم گنوا کر کار خرید لی تھی اور دوسرے دن وہ کار مجھے دکھانے لے آیا۔ کالے رنگ کی مورس ۴۸ ماڈل تھی اور اس کے کسی جاننے والے نے دو ہزار میں جس کے ایک ہزار پیشگی لے لئے تھے' قسطوں پر دی تھی۔ کار سے دروازے کے شیشے مالک نے پہلے ہی نکال کر شاید اپنے پاس رکھ لئے تھے' پچھلے شیشے کی بھی بری طرح درگت بنی ہوئی تھی۔ سیٹیں الگ سے نکلی ہوئی تھیں اور اینٹوں پر ان کو ٹکایا گیا تھا۔ اسٹارٹ ہونے سے پہلے اڑیل گھوڑے کی طرح نخرے کرتی تھی۔ تیسرے دن کالا ہم کو "لب مہران" گھمانے کے لئے کار لے آیا۔ میرے پاس آیا تو آگے مس ہمی اور پیچھے ہرنائی اور "اونٹ" بیٹھے ہوئے تھے "لب مہران" تک چل سکے گی نا؟" میں نے پیچھے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کالی زبان والے تم چلو تو سہی۔" اس نے گاڑی کا سیلف دباتے ہوئے کہا گاڑی ایک فرلانگ ہی چلی ہوگی کہ گھڑ گھڑ کرکے رک گئی۔

"تمہاری زبان واقعی کالی ہے۔"

حنیف غصہ سے کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے بولا۔

"اس کی کالی زبان سے زیادہ تمہارے کالے رنگ کا اثر ہوا ہے۔"

"اونٹ" بھی دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے بولا۔

"کیا ہوا یار۔"

ہرنائی نے اندر سے پوچھا۔

"کیا پھر' کیا ہوا۔" کالے نے غصے سے کہا۔ "پٹرول ختم ہوگیا ہے۔"

"تو بوکھلا کیوں گئے ہو۔ سامنے ہی تو پیٹرول پمپ ہے۔"

ہمی نے منہ ٹیڑھا کرکے کہا۔

"یہی تو ہماری کار کی خوبی ہے کہ پٹرول ہمیشہ کسی پمپ کے آگے ہی ختم ہوتا ہے۔"

کالے نے نخوت سے سر اٹھا کر کہا کہ خدا کرے کہ "اگر حادثہ ہو تو ہسپتال کے سامنے ہو۔" میں نے کہا تو "اونٹ" اور ہمی کے منہ سے قہقہے نکل گئے۔ جب لب مہران سے واپس آئے تو ہڈی پسلی' جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ بعد میں ہرنائی نے کالے کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کار میں سیٹوں کی بجائے مونڈھے (موڑھے) رکھواتا تو اچھا تھا۔

کالے کی کار کی ایک دوسری خوبی بھی قابل ذکر تھی۔ وہ یہ کہ اگر اسے خراب ہو کر کہیں رکنا ہوتا تو وہ ریلوے کراسنگ تھی۔ ریل کی پٹڑی کے بالکل بیچ میں۔ "اونٹ" اس خوبی کو دل لگی کے نام سے یاد کرتا تھا۔ آخری دنوں میں آخری حادثہ سے پہلے تو بے چاری آدھ فرلانگ تک دھکا دینے کے بعد اسٹارٹ ہوجاتی تھی۔ دھکے کے لئے بھی کالا برابر کے اسکول کے بچوں کی خدمات لیتا تھا۔ چھٹی کے دن اسی وجہ سے وہ گاڑی گھر سے آدھ میل دور ایک چڑھائی پر کھڑی کرتا تھا۔ "اونٹ" کہتا تھا کہ "سکھر کے عوام کے لئے تین مصیبتیں ہیں' نمبر ایک تھان کی بھینس' دوسری مونسپلٹی کے راستے' تیسرے' کالے کی کار۔"

کالے کا حادثہ اس کے عشق کے لئے مہلک سانحہ بن گیا۔ اس حادثے کے بعد کار اور ہمی دونوں اس کے پاس سے چلے گئے اور اسے جلدی ہی بھرجانے والے جدائی کے گھاؤ دے گئے۔ یہ حادثہ اس وقت درخت سے ٹکرا جانے کی وجہ سے ہوا جب وہ ہمی کو لیبر تھر کے انسپکشن روڈ پر ڈرائیونگ کے آخری سبق دے رہا تھا۔ اسی رات حادثے کی خبر ہرنائی کو ہمی کے گھر سے معلوم ہوئی۔ صبح اس نے آکر ہم کو بتایا ہم جلدی جلدی ہسپتال پہنچے۔ وارڈ انچارج نے بتایا کہ دونوں کو رات دیر سے ڈسچارج کر دیا گیا ہے۔

اچھا تو مائنر انجریز (ہلکے زخم) ہوں گی۔" اونٹ انگوٹھا چوستے ہوئے بولا۔ "نہیں نہیں' زخم تو کافی گہرے تھے لیکن ان کی حرکتیں بھی گہری تھیں۔" ڈاکٹر نے انکشاف کیا۔

"سارا دن وہ فلمی ڈائیلاگ بولتے رہے اور رات شروع ہوئی تو دو گانے گانے شروع کئے۔ مریضوں کے کہنے پر بھی جب وہ چپ نہیں ہوئے تو وہ سارے جلوس بنا کر سول سرجن کے بنگلے پر گئے اور کہا یا تو ان لوگوں کو ڈسچارج کیا جائے یا پھر ان دونوں عاشق کیڑوں کو......... ہمیں مجبوراً انہیں آدھی رات کو چھٹی دینی پڑی۔" ہسپتال سے کالے کے گھر تک پہنچے۔ موصوف بے چینی سے کمرے میں چہل قدمی فرما رہے تھے۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور بائیں بازو پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا جو گردن سے بندھی ہوئی پٹی میں لٹک رہا تھا۔

یاڑ (یار) نیر' (خیر) تو ہوگیا نا۔" ہرنائی نے بات شروع کی۔

"خیر کہاں ہے۔" حنیف پھٹ پڑا۔

"بس کچھ ہی کسر رہ گئی تھی۔" اس نے حسرت سے ٹھنڈی سانس بھری۔

"بے چاری ممی کا جانے کیا حال ہے؟"

اس نے تھوڑی دیر ٹھہر کر سوال کیا اور پھر ایک ہاتھ سے سگریٹ سلگا کر گنگنانے لگا۔

"ظالم زمانہ مجھ کو....... تجھ سے چھڑا رہا ہے۔" ہسپتال میں ہی صبیحہ عرف ہمی کے رشتہ داروں کو ان کے حدود پھلانگنے کا پتہ چل گیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے ہمی پر کڑی نگرانی اور نظر رکھنی شروع کی۔

کالا روزانہ گردن میں بازو لٹکائے اس کے گھر کے نیچے سے گاتا ہوا گزرتا تھا۔ اس لئے انہوں نے گیلری والے دروازے کو کیلیں ٹھونک کر بند کروا دیا تھا۔ اس دوران کالے نے ہم سے ملنا جلنا کم کر دیا تھا اور ایک آرٹسٹ سے دوستی کرکے اسے اپنی بیٹھک میں ٹھہرایا تھا۔ اس نے بیٹھک کی ساری دیواریں ہمی کی تصویروں سے بھر دی تھیں اور وہ دن رات ان تصویروں سے باتیں کرتا رہتا اور "...... ہمی تصویر تیری دل میرا بہلا نہ سکے گی" قسم کے گانے گنگناتا رہتا۔

ایک شام جو ہم اس کی بیٹھک پر گئے تو وہ گیلری میں بیٹھا ہمی کی تصویر بنا رہا تھا۔ اس کو تصویر بنانے کی کوئی خاص مشق نہیں لگ رہی تھی۔ بس ٹھیک تھی۔ وہ ہم سے باتیں کرنے کے بجائے اپنے کام میں لگا رہااور گنگنانے لگا۔

"تصویر بناتا ہوں.... تصویر نہیں بنتی۔"

"بنے بھی کیسے۔" اونٹ نے کہا۔

"ڈیئر پینسل جو استعمال نہیں کررہے ہو" جب ہم دوبارہ اس کے پاس گئے تو اس کی میز ڈیئر پنسلوں سے بھری ہوئی تھی لیکن تصویر ادھوری پڑی ہوئی تھی۔

اس کے عشق کا بھوت اس وقت اترا۔ جب ہمی کے رشتہ داروں نے اس کے ٹھیک ہو جانے کے بعد اس کی شادی کر دی۔ جس وقت ہمی کی بارات بڑی دھوم دھام سے جارہی تھی تو اس وقت ہم کالے کے پاس بیٹھے کوئٹہ جانے کا پروگرام بنا رہے تھے اور اس بات پر کالا بے حد سنجیدہ لگ رہا تھا کیونکہ صبح ہی ایک کباڑیئے نے اس کی کار ساڑھے چار سو میں خرید لی تھی۔

رشیدہ حجاب

نواور دس

تالیوں کے شور میں وہ مائیک تک آیا اور اپنے مخصوص انداز میں اس نے مائیک کو جھکایا۔ ایک ہاتھ اس نے کوٹ کی جیب میں ڈالا اور زندگی سے بھرپور نظر مجمع پر ڈالی لوگوں کا بہت زیادہ ہجوم تھا۔ وہ سب نہایت شوق اور پیار سے اس کو سننے کے لئے آئے تھے۔

"تو پھر میرے سائیں........"

اور اگلی قطار میں بیٹھے ہوئے ایاز نے چپکے سے آنا کے کان میں کہا۔ "نجمی کے بالوں میں صبح کی سپیدی بکھر گئی ہے۔ گزرے سال اس کے چہرے پر اپنے نشان چھوڑ گئے ہیں لیکن اس کے دلکش انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہی خوبصورت آواز وہی شوخی بھرا وقار!"

نجمی کہہ رہا تھا۔

"پاشا کے غرور کو اس دن زبردست ٹھوکر لگی۔ جس دن "چاندنی" کے ایڈیٹر نے اسے لکھا پاشا صاحب، ادارہ آپ کے حکم کی تعمیل کرنے سے قاصر ہے کیونکہ ناز صاحبہ پردہ کرتی ہیں اور اپنے چند اصولوں کی سختی سے پابندی کرتی ہیں۔ ان چند میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ محترمہ کے گھر کا ایڈریس کسی کو بھی نہ دیا جائے۔ خط کے آخر میں یہ نوٹ لکھا تھا کہ پہلے نمبر پر ناز کا افسانہ شائع ہوگا۔ خط پڑھ کر اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

"کم بخت، خوشامد پسند، ذلیل کہتے اس نے ہر قسم کی تہذیب اور اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر گالیاں دینا شروع کیں۔"

"کس کو نوازا جارہا ہے۔" اس کے دوست خالد نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

"یہ "چاندنی" کا ایڈیٹر، منحوس، عاشق مزاج" غصہ میں اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ایڈیٹر بیچارا تو بزرگ اور بال بچوں والا تھا اور اس پر یہ سنگین الزام لگانا بہت زیادتی تھی۔

"پھر کیا ہوا!"

"ہوتا کیا؟ ناز کا ایڈریس نہیں دے رہا۔"

"تو تم کیوں اپنا خون جلا رہے ہو۔ میاں مجنوں؟"

خالد اس کو سمجھاتا رہا۔ وہ خود بھی بے وقوف تو نہیں تھا اچھی طرح اپنی بے جا خواہش اور ضد کو

سمجھ رہا تھا' لیکن وہ پاشا تھا ضدی اور خود سر۔ آج تک ایسا ہوا ہی نہیں کہ وہ کوئی خواہش کرتا اور وہ پوری نہ ہوئی ہو۔ خوبصورتی اور ذہانت نے اس کو ہر حلقے میں مقبول بنا دیا تھا۔ اسی دن جب اس نے ادبی میدان میں قدم رکھا تھا تو جیسے خزاں رسیدہ باغ میں بہار آگئی تھی اس کے قلم میں جوش تھا۔ انداز میں جاذبیت اور جدت تھی' دیکھتے ہی دیکھتے وہ ادبی دنیا کے سورج کے نام مشہور ہوگیا تھا۔ یوسف پاشا کا سرورق پر نام ادبی رسالوں کی فروخت میں دن بہ دن اضافہ کرتا رہا۔

انہیں دنوں ایک دن اس نے غرور سے اپنے خوبصورت بالوں کو جھٹکا دے کر خالد سے کہا تھا "خالد' دنیا میں ایسے خوش قسمت انسان بہت کم ہوتے ہیں۔ اسی مشہور رسالے چاندنی کو دیکھ کر میں نے کہا تھا کہ ایک دن اس رسالے کے پہلے افسانے کا عنوان میں خود ہوں گا اور..........."

"اور اب وہ سب ختم ہو چکا ہے آنکھیں کھولو میرے دوست صبح کے آٹھ بج رہے ہیں۔" خالد نے اس سامنے چاندنی کا تازہ پرچہ لہراتے ہوئے کہا۔

سرورق کی تصویر اور اس پر لکھا ہوا تھا "خوابوں کا شہر" دونوں اجنبی تھے اور نیچے خوبصورت الفاظ میں "ناز" لکھا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اسے لگا جیسے وہ واقعی خواب دیکھ رہا ہو' لیکن وہ بیدار تھا۔ کھڑکی سے اندر آتی ہوئی تیز دھوپ میں چمکتے ہوئے حروف "ناز" خواب تو ہرگز نہیں ہوسکتے تھے دوسرے نمبر پر اس کا افسانہ تھا "قیامت کا دن" اتنے سالوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اس کا افسانہ معمولی طرح سے پیش کیا گیا تھا۔ یہ کوئی دنیا کی نرالی بات نہیں تھی۔ آخر ایک نہ ایک دن تو وہ جگہ کسی دوسرے کو لینی ہی تھی لیکن اس طرح زبردستی اور بے عزتی کرکے اور عین اس وقت جب وہ اپنی کامیابی اور سربلندی کا اعلان کررہا تھا۔ اس وقت ناز جبین کو کیا حق پہنچتا تھا' اس کو کیا ضرورت تھی؟ وہ ناکامی اور حسد کی آگ میں جلنے لگا........ اور دیکھتے ہی دیکھتے سورج تاریکیوں کے سمندر میں ڈوب گیا۔ آسمان پر خوبصورت فرحت بخش' پرسکون چاند کی روشنی پھیل گئی۔ "چاندنی" ہو یا "فنکار" ہر ادبی رسالے کے ماتھے پر ایک ہی نیک چمک رہا تھا۔ اس کو ناز جبین کے نام سے نفرت ہوگئی تھی۔ اس کا شاہکار سے شاہکار افسانہ بھی ناز جبین کو پیچھے نہیں ہٹا سکا تھا۔ آخر کار جل بھن کر اس نے "چاندنی" کے ایڈیٹر کو لکھا تھا کہ مجھے ہر قیمت پر ناز کا ایڈریس چاہیے....... اور اس کے بعد اس کا افسانہ سرورق کی زینت نہیں بنے گا۔ اس کے غصہ پر ایڈیٹر نے برف سے بھری بالٹی انڈیل دی تھی جس کی وجہ سے اس کے سارے وجود پر اداسی اور ناکامی کی سرد کیفیت طاری تھی اور خالد اس کو سمجھا رہا تھا۔

"مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمہارا ظرف اتنا چھوٹا کیوں ہے ادب تمہارے باپ کی ملکیت تو نہیں۔"

"یہی تو افسوس ہے' خالد یہی تو افسوس ہے باپ کی ملکیت ہوتا تو اتنا دکھ کبھی نہ ہوتا۔ یہ تو میری اپنی کمائی تھی' میرا ریاض' میری سوچ' میری ذہانت کی پونجی تھی اس پر اس طرح ڈاکہ ڈالنے کا اس کو کیا حق تھا؟" وہ گلوگیر ہوکر بولا۔

"تمہارا تو دماغ خراب ہوا ہے اور اس کے علاوہ میں کیا کہوں لیکن پاشا پاگل نہ بنو تمہارا مقام تم سے چھن گیا ہے۔ اس حقیقت کو قبول کر لو....... اور جو کچھ بچا ہے اس کی حفاظت کرو۔" خالد نے ہمدردی سے اسے سمجھایا۔

ہمدردی کے ان چند الفاظ نے اس کے غصہ کی آگ پر مٹی کے تیل کا کام کیا۔ اس کی فطری خود سری اور غرور ایک دم جاگ اٹھے۔ نفرت سے رسالہ ایک طرف پھینکتے ہوئے بولا۔ "تمہاری مہربانی خالد لیکن تم تو مجھے جانتے ہو نا؟ میں تھوڑا سا کینہ بھی ہوں اور حساس اور کم ظرف بھی! ایک دن....... ایک دن دیکھنا خالد میں اس نازجبین کا نام و نشان تک مٹا دوں گا۔" اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں عزم اور نفرت کی آگ تھی اس وقت خالد نے سوچا تھا' کہ اس دفعہ پاشا کے غرور کو دوسری ٹھوکر لگے گی!

بہت دن گزر گئے لوگوں کے ذہنوں سے پاشا کا نام آہستہ آہستہ مٹنے لگا۔ پاشا کہاں تھا یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا' اس کا محل نما گھر اور اس میں رہنے والے نوکروں کی فوج سب اداس تھے۔ خالد نے بھی اس کی خیر خبر پوچھنی چھوڑ دی تھی....... اور پاشا' اپنے خوبصورت محل سے سینکڑوں میل دور ایک چھوٹے سے برآمدے میں نیم شکستہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے آخر کار ناز کا پتہ لگا لیا تھا۔ تھوڑے سے فاصلے پر نازجبین بیٹھی ہوئی تھی۔ پیاری پھولوں کی نازک پنکھڑیوں کا ذکر لکھنے والی' ستاروں کی جھمجھاہٹ کاغذ پر اتارنے والی' خوابوں کے جزیروں میں سائے کی طرح محو شہزادیوں کی سسکیاں بکھیرنے والی "نازجبین" بے حد موٹے اور کسی قدر بے ڈول جسم والی لڑکی اسے ناز جبین کے افسانوں کا مذاق اڑاتی ہوئی لگی۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ برآمدے کی الماری میں آئینہ لگا ہوا تھا اور اس میں یوسف پاشا کی تصویر نظر آرہی تھی وجاہت اور وقار کا مکمل نمونہ۔ ایک دفعہ مایوسی سے اس کی گردن جھکی اور دوسرے لمحے غیر ارادی طور پر بلند ہوگئی۔ میں جھکنے کے لئے پیدا ہی نہیں ہوا ہوں۔ اس نے غرور سے سوچا۔

ناز جبین چپل کو گھسیٹنے والے انداز سے چلتی ہوئی اندر چلی گئی تو اس کا بڑا بھائی باہر آیا۔ پاشا کو اس نے غور سے اس طرح دیکھا جیسے اس کی ذہنی حالت پہ شبہ ہو آہستہ آہستہ اس نے کہنا شروع کیا "پاشا صاحب میں حیران ہوں۔ واقعی سخت تعجب کی بات ہے....... دیکھیں نا آپ کی اور ہماری حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس کے علاوہ میری بہن....... یعنی شہناز....... نہایت معمولی شکل و صورت کی ہے۔ اس وقت تک ہمارے طبقے کے کسی بھی شخص نے اس کا رشتہ نہیں مانگا آپ تو ماشاء اللہ........"

"دیکھیں میں ظاہری خوبصورتی کا قائل نہیں ہوں۔" وہ اس کی بات بیچ میں ہی کاٹتے ہوئے مکاری سے بولا..... حالانکہ اس کے ذہن کے پردے پر اس وقت فریدہ کے خوبصورت اور پیارے چہرے نے جھانکا تھا' جس سے وہ کافی عرصے سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

"سیرت کا حسن اور خیالات کی پاکیزگی دوسری ہی چیزیں ہوتی ہیں بھائی اور وہ آسمانی عکس مجھے "ناز" میں نظر آتا ہے....... انکار نہ کریں!"

اس کے بھائی نے گردن جھکالی۔ انکار تو وہ کسی صورت بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ کچھ مہینوں سے جو

مد یوسف نے اس گھر کی کی تھی اس سے مجبور ہو کر انہوں نے جب ناز کو بے نقاب کیا تھا تو پھر ساری عمر عیش کرنے کے لئے بہن کی شادی کچھ اتنا مہنگا سودا بھی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس نے سوچا کہ اس پاگل کے علاوہ اور کون اس کے لئے منتیں کرے گا۔

شادی کے چند مہینوں تک ناز جبین نے ایک دفعہ بھی کسی رسالے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اس کی خوشی اور غرور کی حد نہ رہی تھی۔ ایک دن وہ باہر سے آیا تو ناز نہایت غور سے چاندنی کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدموں میں جیسے کسی نے زنجیر ڈال دی ہو....... کیا یہ پھر واپس آ رہی ہے؟........ کیا یہ ابھی کوئی دوسری شکست مجھے دے گی؟ کچھ سوچ کر وہ آگے بڑھا۔ رسالہ اس کے ہاتھوں سے لے کر پیار سے بولا "ڈارلنگ یہ کیا؟ ابھی سیدھی کہانیاں پڑھ رہی ہو! چلو تو بازار چلیں آج قاسم کی دوکان پر وہ غضب کی ساڑیاں آئی ہیں کہ اگر دیکھو گی تو پاگل ہو جاؤ گی۔ چلو تو ایک دو ساڑھیاں لے کر آئیں" پھر اسی لمحے اس نے "چاندنی" رسالہ کھڑکی سے باہر پھینکتے ہوئے کہا تھا۔

"ڈیئر تم کمال کرتی ہو۔ ایک بے جان بے کار "چاندنی" کا تم کو اتنا خیال ہے اور وہ جو تمہارا جاندار آفتاب ماہتاب بچہ رو رہا ہے۔ اس کو نہیں اٹھاؤ گی۔"

اس طرح آہستہ آہستہ ناز جبین ادب سے دور ہوتی گئی۔ لکھنا تو دور کی بات ہے وہ پڑھنا بھی بھول گئی۔

کبھی کبھی وہ اس کو تنگ کرنے کے لئے کہتا تھا۔ "ناز صاحبہ کوئی تازہ افسانہ تو لکھو۔ اس دفعہ ناز پاشا کے نام سے چاندنی میں بھی بھیجیں گے۔ مزہ آجائے گا۔"

لیکن وہ ہنس ہنس کر ٹال دیتی تھی۔

بس آفتاب کو جھولے میں سلا دوں تو پھر دیکھوں گی۔" یا "سیمی کو باہر بھیج کر ابھی آتی ہوں........"

لیکن پھر آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر ایسے موقع پر اس کے چہرے پر اداسی اور افسردگی کے سائے لہرا جاتے تھے۔ دکھ سے گردن جھکا کر کہتی تھی۔

"چھوڑیں اس بات کو اب تو ماضی کی ہر داستان دفن ہو گئی ہے۔"

ناز جبین کا یہ جملہ سن کر اور اس کے چہرے پر ناکامی اور محرومی کے تاریک سائے دیکھ کر اس کا دل خوشی سے پھولے نہ سماتا تھا۔ یہ تاریکی دیکھ کر وہ اپنے نصیب کی سیاہی بھی بھول جاتا تھا جو شہناز کی صورت میں لگ گئی تھی۔ وہ فریدہ کو بھی بھول جاتا تھا۔ جو اتنے سال گزرنے کے بعد بھی اس کے تصور کے پردے پر چپ چاپ کھڑی تھی۔ ایک دن پندرہ سال کے بعد اس کی اچانک خالد سے کسی دوکان پر ملاقات ہو گئی تو اس نے اس کو کالر سے پکڑ کر اس کا رخ دوکان کے باہر کھڑی ہوئی کار کی طرف کیا جہاں بے ہنگم بے ڈول اس کی بیوی تو بچوں کو سنبھالے ہوئے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ پرجوش آواز میں بولا "دیکھو خالد اچھی طرح دیکھو یہ ناز جبین ہے۔ تمہیں یاد ہے یہ نام؟ بتاؤ........ بتاؤ اب اس کو کون پہچانتا ہے؟ کون سے رسالے کی پیشانی پر اس کے نام کا ٹیکہ ہے؟...... بتاؤ!"

تالیوں کا شور ایک دفعہ پھر گونج اٹھا اور پروفیسر نجمی نے نیاز مندی سے اپنی گردن کو تھوڑا سا جھکایا۔ نیچے اترنے لگا تو کسی نے مجمع میں سے پوچھا۔

"افسانہ تو واقعی بے حد اچھا تھا پروفیسر نجمی لیکن عنوان نہ تو آپ نے بتایا نہ سیکرٹری نے؟"

مجمع قہقہے لگانے لگا۔

پروفیسر خوبصورت انداز میں مسکرایا اور دوبارہ مائیک سنبھالا۔

"ویسے تو یہ افسانہ بلا عنوان بھی ہو سکتا تھا' لیکن میں نے اس کا عنوان نو یعنی تاش کے پتوں والا نو رکھا ہے۔"

تالیوں کا شور ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ لوگوں نے دیکھا کہ بالکل آخری قطار میں کرسی پر بیٹھی ہوئی ایک خاتون اپنے بھاری بھرکم وجود کو سنبھالتی ہوئی آہستہ آہستہ اسٹیج کی طرف جا رہی تھی۔ مائیک کے پاس آکر اس نے چاروں طرف نظریں گھمائیں اور پھر اگلی قطار میں بیٹھے ہوئے پروفیسر نجمی پر نظریں جماتے ہوئے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا "میرا شوہر یعنی مشہور ادیب نجمی صاحب واقعی بے حد قابل افسانہ نگار ہے۔ تلخ حقیقت پر افسانے کا نازک پراسرار اور خوبصورت نقاب ڈالنا واقعی عظیم فن ہے' لیکن اس افسانے کے کچھ نازک اور اہم حصے کا پتہ شاید میرے شوہر کو بھی نہیں ہے۔ میرا بھی اس افسانے کے کرداروں کے ساتھ کچھ تعلق ہے اور اس کے متعلق مختصر حقیقت کا انکشاف میں کروں گی۔ میرا خیال ہے یہ حقیقت میرے افسانہ نگار شوہر کے دلچسپ افسانے سے زیادہ دلچسپ اور شاندار ہوگی۔"

اتنا کہہ کر اس نے پھر غور سے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ اس کا شوہر تو بہت تعجب اور ناراضگی کے ساتھ اس کے اس بے باک انداز کو دیکھ رہا تھا لیکن باقی لوگ بھی نہایت خاموشی سے اس کو سننے کے لئے بے تاب نظر آ رہے تھے۔ اس نے آہستہ لیکن جوش میں کہنا شروع کیا۔

"پاشا جس لڑکی کو "ناز جبین" سمجھ کر شکست دے کے اپنے گھر لے آیا تھا وہ دراصل ناز نہیں تھی یعنی شہناز جبین تو وہ ضرور تھی لیکن ناز جبین سے اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا....... افسانہ تو بڑی بات اس غریب نے رانی اور بادشاہ والی روایتی کہانی بھی نہیں لکھی تھی....... افسانے تو اس کا بیمار چچا لکھتا تھا....... وہ اپنے نام کے بجائے اپنی بھتیجی ناز جبین جس کے متعلق اس بدنصیب انسان کو شک تھا کہ وہ منحوس ہے کے نام سے افسانے لکھنے شروع کئے۔ ناز بے چاری پاشا کے منہ سے لکھنے کا سن کر افسردہ ہو جاتی تھی کیونکہ اس کے اس عزیز چچا کا اس کی شادی کے دو سال بعد ہی انتقال ہوگیا تھا۔۔۔"

تالیوں کے شور میں بیگم نجمی نیچے اتری لیکن اس کے سوا کسی نے بھی یہ نہیں دیکھا کہ پروفیسر نجمی کا سر بے حد جھکا ہوا تھا۔

سراج
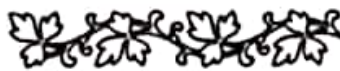
خون آلود رات

برہنہ رات برہنہ بیابان...... اور کمزور دکھی دل! ریت پر سفر ویسے تو پہاڑوں کے سفر کی طرح مشکل تھا لیکن اس کے پاؤں اندھیرے میں بھی راستہ بناتے جا رہے تھے۔ چھوٹے بڑے ٹیلوں کو روندتے ہوئے اپنی منزل کے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ بیابان کی رات پریتم کے نینوں کی طرح سرد ہوتی جا رہی تھی۔ راستے کے تعین کی یقین دہانی کے لئے اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا اور اس کھلے ہوئے برہنہ آسمان کو دیکھ کر اسے یوں محسوس ہوا جیسے رات اپنا نیلا نیلا بے لباس جسم تاروں کے آنچل میں چھپائے ہوئے شرما رہی ہو۔ اس سے اس کو اپنی "سوہل" یاد آگئی۔ ایک اجلے اجلے تارے نے ٹمٹما کر مسکراتے ہوئے اس کو آنکھ ماری...... اور اسے یقین ہو گیا کہ رات اور بیابان اس سے بے وفائی نہیں کریں گے۔ کریں گے بھی کیسے؟ وہ تو اس بیابان کا یار تھا...... برہنہ بیابان جس کے بے لباس چھوٹے بڑے ریتیلے ٹیلوں کی پرچھائیوں میں اس نے انتظار کی کئی راتیں تارے گنتے' سانپوں کی گزرگاہوں کو دیکھتے' سوہل کا تصور کرتے ہوئے گزار دی تھیں۔ جب سوہل کے پیار میں وہ میلوں چل کر آتا تھا۔ تب بیابان اس کے لئے سب سے بڑا آسرا اور پناہ گاہ تھا' جب موں عامل نے لسوڑے کے درخت کے نیچے اس کا بت بنا کر اور اس میں کانٹے چبھو کر دبایا تھا' تب بھی اس بیابان نے اس کے ساتھ یاری نبھائی تھی اور ہوا کے ایک جھونکے سے ہی بت کے ساتھ لسوڑے کا درخت بھی ریت کے سفید ڈھیر میں دب گیا تھا اور اس دن اس نے سوہل کے گورے بازو میں پڑے ہوئے ہاتھی دانت کے بازو بند کو پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔

"سوہل' قسم کھاؤ کہ میرا پیار تمہیں ہمیشہ یاد رہے گا!"

"تمہاری قسم!"

اس قسم میں کتنی سندرتا تھی' کتنا چنچل یقین تھا۔ سوہل اس کے لئے بیابان کی رانی تھی۔ سوہل کے لئے وہ ایک موں عامل تو کیا سارے تھر کا دشمن ہو سکتا تھا۔ سوہل کی یاد آتے ہی اس کے پیروں میں نئی ہلچل پیدا ہو جاتی اور اس کے پورے جسم کی تھکن اتر جاتی تھی۔ اس کا پیار سوہل کے انگ انگ اور ایک ایک لٹ میں سمایا ہوا تھا۔ سوہل کہتی تھی کہ پتہ نہیں کیوں جب اس کے کان بندے کھینچنے سے درد کرتے ہیں' تب بھی اس درد میں وہ یاد آتا ہے۔ ہاتھی دانت کے بنے ہوئے بازو بند کھینچنے سے بھی دل میں ہلچل مچتی تھی جب وہ کسی سکھی سے بالوں میں کنگی کرواتی ہے تب بھی ایک ایک لٹ کھینچنے سے وہی دل میں اتر آتا ہے۔ سب سے زیادہ ہنسی والی بات تو وہ تھی کہ جب سے وہ سوہل کے سپنوں میں سچائی بن کر آیا تھا' تب سے سانپوں سے بچنے کے لئے تکیے کے نیچے لسن

کی کھنی کی بو بھی بدل گئی تھی اور اس میں سے اسے اس کے جسم کا قرب اور اس کی سانسوں کی مہک آتی تھی۔

بہت ہی پگلی تھی اس کی سوہل! جب مو عامل نے اسے کہا تھا کہ وہ اس پر ایسا جادو کر دے گا کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر جائے گا' تب اس نے اسے کہہ دیا تھا کہ "مو اگر وہ مر گیا' تو سوہل بھی مر جائے گی۔"

مو عامل کو اب اس بات سے بھی ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں وہ کاکا سے شکایت نہ کر دے کہ کنویں سے واپس آتے ہوئے مو اسے تنگ کرتا ہے۔ جب مو عامل کے دبائے ہوئے بت کو ریت نے دبا دیا تھا' تب مو تلملاتا اور دانت پیستا رہ گیا تھا۔ اس کی شان ختم ہو گئی تھی اور جن لوگوں کو ٹھگ ٹھگ کر اس نے پیسے کمائے تھے وہ بھی اب اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

لوگوں میں اب کھلم کھلا اس کے اور سوہل کے پیار کے بارے میں چہ میگوئیاں ہوتی تھیں۔ دو چار معتبر لوگوں نے کاکا سے کہہ دیا تھا کہ بچی کو کب تک بٹھاؤ گے۔ ان کے پیار کی کہانی تو اب تھر کے ٹیلوں کو بھی رلا رہی ہے یا تو کمبخت کو اچھی طرح منع کر دو یا دو بول پڑھوا کر رخصت کر دو۔

اس دن سوہل برق رفتاری سے اس کے پاس پہنچی تھی اور وہ حیرانی سے سوہل کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ گرم دھوپ اور تپتی ریت پر بھاگتے ہوئے اس کے چہرے کا رنگ جھلس گیا تھا۔ اس کے ہانپنے سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گرم گرم ریت سانس لے رہی ہو۔ پسینے سے اس کی لال چولی کا رنگ کالا ہو گیا تھا۔ اس کے بال بکھر گئے تھے۔ سوہل کو دیکھ کر وہ ذرا سا گیا پتہ نہیں کیا ہوا ہے؟ جب سوہل اس کے سامنے ہانپتے ہوئے کھڑی ہوئی اور پل بھر کے لئے اسے گھور کر دیکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے سوہل اس بیابان کی بھوکی پیاسی ہرنی ہو جس کو آخر کار بڑے آبشار کے بجائے چھوٹا سا جھرنا نظر آگیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی ہی نئی جوت پیدا ہو گئی تھی' جس میں تھر کی اتھاہ وسعت کی بجائے کسی خیابان کا سکون لوٹ آیا تھا۔ اس کی سانسوں میں کسی بانسری کا سر سا گیا تھا۔

جب اس نے اپنے ہاتھوں میں سوہل کے ہاتھ پکڑ کر اس کی آنکھوں کے جھرنوں میں جھانکا اور اس بدحواسی کا سبب پوچھا تب سوہل کے ہاتھ حیا' حجاب اور شرم سے لرز گئے۔ اس کا ہانپنا اچانک رک گیا' اس کی آنکھوں میں اچانک ایک نئی جوت جاگی اور وہ اس کی طرف گھورنے کی بجائے پاؤں کے انگوٹھے سے ریت کھرچتے ہوئے اس کے پیروں کی طرف دیکھنے لگی' جیسے وہ اسکے قدموں میں اپنی جگہ تلاش کر رہی ہو۔ وہ اس طرح دیکھنے کے انداز سے ہی سمجھ گیا اور اس کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل پھیل کر اتنا وسیع ہو گیا ہو کہ سارے تھر کو اپنے اندر سما سکے۔

"سچ؟" اس نے بالکل مختصر سوال کیا تھا۔ وہ اس سحر کو توڑنا نہیں چاہتا تھا' سوہل نے آہستہ سے سر کو اقرار میں ہلایا اور ہاتھ چھڑا کر کنوئیں والے راستے کی طرف دوڑتی چلی گئی۔ جیسے ہرنی اپنی پیاس بجھا کر واپس اپنے غول کی طرف بھاگ گئی ہو۔ کچھ دیر کے لئے وہ اس نئی سوہل کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ سوہل جو آج سے پہلے اس سے بہت دور تھی اب اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بن گئی تھی۔ وہ جو پہلے اپنی ہوتے ہوئے بھی غیر تھی اور وہ اب غیر ہوتے ہوئے بھی اس کی اپنی تھی۔ اس نے اس احساس کو دائمی کرنے کے لئے اس اپنائیت کو خود میں سمو دینا چاہتا تھا۔ سوہل اس کی کیا بنی جیسے پورا تھر' یہ ریت کا سمندر اس کا اپنا بن گیا تھا اور وہ ریت پر لوٹیں لگانے لگا

جس طرح اس کے اونٹ ریت پر لوٹیں لگاتے تھے۔ اس کے منہ' ناک اور کانوں میں گرم گرم ریت گھسنے لگی' لیکن آج اس کے منہ میں ریت کی کرکر بھی عجیب مزہ دے رہی تھی' وہ یہ مزہ کسی طرح بھی گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

ساون کے بعد ان کا بیاہ ہونا تھا لیکن اس کو یہ مہینے بھی گزارنے مشکل لگ رہے تھے۔ بڑی بات تو یہ تھی کہ اب سول نے بھی ریت کے ٹیلوں پر آنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ خود ہی پیاس کا بہانہ کرکے کنویں تک آتا تھا لیکن اس کو دیکھ کر سول کی سہیلیاں چھیڑتی تھیں "کم بخت پاگل ہو گیا ہے" اور وہ شرمندہ ہوکر واپس لوٹ آتا تھا اور اپنے ریت کے ٹیلوں سے سول کی باتیں کرنے لگتا تھا۔

لیکن اس سال ساون نہیں آیا۔ ساون کی بجائے خشک سالی اتر آئی۔ آسمان کو تکتے تکتے منتظر آنکھیں تھک کر مایوس ہوکر ابر آلود ہو گئیں۔ جب میاں عثمان بھی اپنی کنیا کو تالا ڈال کر سندھ کی طرف چلا' تب تو آس پاس کے جھونپڑیوں سے بھی نقل مکانی شروع ہو گئی۔ ڈیپلو' مٹھی' چھاچھرو' عمرکوٹ جہاں کہیں سے بھی اونٹ سوار آتے تو خیر کی خبر نہیں لاتے تھے سارا علاقہ قحط کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ جب مٹکوں سے اناج کے آخری دانے بھی ختم ہو گئے' جب گھاس کے ڈھیر بھی خشک ہو گئے' جب پالتو جانور بھی ریت کے ٹیلوں کی اوٹ میں مرنے لگے' جب بھوک کا کالا دیو لوگوں کو کھانے لگا' تب وہ بھی نہ سہ سکا سامان سمیٹ کر اس نے بھی سندھ کا رخ کیا۔ راستے میں کاکا کی کنیا کے پاس ٹھہر گیا۔ کاکا اس کو سازو سامان کے ساتھ دیکھ کر دور ہی سے سمجھ گئے تھے کہ وہ بھی گھر چھوڑ کر سندھ کمانے جا رہا ہے۔ ماں باپ اور چھوٹے بھائیوں کی بھوک اب وہ زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے اونٹ بھی بھوک سے بلبلا رہے تھے۔ اس کی آنکھیں کاکا کے پیچھے کچھ ڈھونڈ رہی تھیں چھپر سے دو آنکھیں........ گیلی ابر آلود آنکھیں...... ساون کی طرح ٹپک رہی تھیں اور اس ساون کو برستا چھوڑ کر قافلے میں شامل ہو گیا تھا۔

آج دو مہینے کے بعد واپس آتے ہوئے بھی اس کو ابر آلود آنکھیں اسی طرح یاد تھیں جیسے وہ ابھی کل ہی کی بات ہو۔ جیسے جیسے ان آنکھوں کا تصور اس کے دل کو تڑپاتا اور کاٹتا ویسے ویسے اس کے قدم ریت کے ڈھیروں کو روندتے گئے۔ پیدل پیدل وہ قافلے سے دو تین میل آگے نکل آیا تھا۔ اچانک فضا میں ایک زوردار دھماکہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی ایسا لگا جیسے زمین کا سینہ کسی نے چیر دیا ہو اور بیابان کی چیخ فضا کو چیرتی چلی گئی ہو۔ ریتلی زمین اس کے پیروں تلے اس طرح لرز گئی جیسے زمین نے کروٹ بدلی ہو اور پلٹ کر الٹنے والی ہو۔ وہ وہیں تھم کر کھڑا ہو گیا اس نے یہی سمجھا کہ کہیں آس پاس بجلی گری ہے لیکن تاحد نگاہ آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ چند ساعتوں کے بعد ایک دوسرا ہیبت ناک دھماکہ اس کے بالکل قریب ہوا....... اور اس کے کان بھی سن ہو گئے اس دھماکے کی گونج سے اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ ایک دوسرا زور دار دھماکہ ہوا...... دھرتی اس کے پیروں تلے نکل گئی۔ وہ منہ کے بل گر گیا ریت کا ایک پہاڑ اس کے جسم کے اوپر کسی کمبل کی طرح گرا۔ دھماکے آہستہ آہستہ قریب ہوتے گئے۔ ریت کے نیلے فوارے کی طرح ریت اڑاتے زور دار آواز سے ایک ہی لمحہ میں بکھر گئے۔ اس کو یوں محسوس ہوا جیسے دھماکوں کے ساتھ ہزاروں گھاس کاٹنے کی مشینیں ریت کو کاٹتی اس کی طرف بڑھتی آ رہی ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ لال روشنی بھی ریت کے ٹیلوں کے پیچھے پھیلنے لگی جیسے کہیں کوئی بڑا سا الاؤ جل اٹھا

ہو۔ بہت دیر آسمان تک آگ کے شعلے بھڑکتے رہے لیکن پھر...... کچھ دیر کے بعد وہ دھاکے آہستہ آہستہ دور ہوتے گئے۔ وہ اپنے اوپر سے ریت ہٹا کر کلمہ پڑھتا ذرتا منہ ناک اور کانوں سے ریت جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک انجانا ڈر اس کے ذہن میں گھس گیا تھا۔ اچانک اس نے دور سے دیکھا کہ سوِل کے گاؤں کی جھونپڑیاں اور چھپر جل رہے تھے بلند ہوتے شعلوں کی آواز بیابان کو ہیبت ناک بنا رہی تھی۔

سوِل! اس کے دل سے چیخ نکل گئی' اور وہ "سوِل' سوِل" کرتا جھونپڑیوں کی طرف بھاگا۔ وہ اپنی زندگی میں اتنا تیز کبھی نہیں دوڑا تھا۔ اس کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے خون میں آگ لگ گئی ہو اور اس آگ کو بجھانے کے لئے اس کا دوڑنا ضروری ہو۔ جب وہ سوِل کی جھونپڑی کے نزدیک پہنچا تو اس نے ایک کڑک دار آواز سنی۔

"ہالٹ!"

لیکن وہ دوڑتا رہا۔ بے اختیار اپنی طاقت سے بھی زیادہ' وہ جیسے اڑ رہا تھا۔ اچانک گولی کی آواز آگ میں گونجی اور اس کے کندھے میں گھس گئی...... وہ ٹھوکر کھا کر سوِل کی جھونپڑی کی چوکھٹ کے پاس گر گیا اس نے خود کو سنبھال کر پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن بائیں ہاتھ پر زور دینے سے درد کی ایک لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ اسکے منہ سے گھٹی ہوئی چیخ نکل گئی۔ "اللہ رے......" اور پھر ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ عین اسی وقت ایک دوسری گولی اس کے سر کے اوپر سے ہوتی ہوئی سامنے جلتے ہوئے چھپر کے شعلوں میں گم ہو گئی۔ اب اس کا ڈر بالکل ختم ہو گیا تھا۔ صرف اس کے چہرے پر عجیب سرخی اور نفرت ابھر آئی تھی اس نے دوبارہ منہ اوپر اٹھایا تو شعلوں کی سرخی مائل روشنی میں اس کو بالکل قریب ایک کٹا ہوا بازو نظر آیا جس میں ہاتھی دانت کا بازو بند ابھی تک سلامت تھا۔ بائیں ہاتھ پر زور دے کر وہ تھوڑا آگے کھسکا اور وہیں بیٹھ گیا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے کٹا ہوا بازو اٹھایا' کہنی سے اوپر بازو بند خون آلود ہو گیا تھا اور کندھے کی طرف سے کچا کچا گوشت اور ہڈی باہر نکلی ہوئی تھی۔ کہنی سے نیچے والا بازو بند آگ کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ ہاتھ میں اب بھی گرمی باقی تھی اسے جانے کیا خیال آیا اس نے بازو کو نئے جذبے اور ایک نئے پیار اور ایک عجیب احساس سے بانہوں میں سمیٹ کر اپنے ہونٹ اس سرد ہوتے ہوئے بازو پر رکھ دیئے...... عین اسی وقت ایک گولی اس کی گردن کو چیر کر دماغ کے چیتھڑے اڑاتی پیچھے کسی تانبے کے برتن میں گھس گئی اور وہ اسی حالت میں سوِل کے بازو کو اپنی بانہوں میں سمیٹے منہ کے بل گر پڑا۔

ثمیرہ زرین

تھوہر کا درخت

رقاصہ چھم چھم ناچ رہی تھی۔ اس کی ساڑھی کا زرتار پلو لشکارے مار رہا تھا۔ وہ لوگوں کے ہجوم میں آگ کے شعلے کی طرح ناچ رہی تھی۔ آسمان پر سولھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ اپریل کی نرم نرم ہوا دور دور تک مہک پھیلا رہی تھی۔ فضلو اپنی نگاہوں میں پیار سموئے یک ٹک رقاصہ کو دیکھ رہا تھا لیکن اس کے دوست تو عجیب مزاحیہ حرکتیں کر رہے تھے۔ کبھی اپنے ہاتھ پر پانچ کا نوٹ رکھ کر اس کی طرف بڑھاتے کبھی دس کا' لیکن ایک بڑے پیٹ والے سیٹھ نے تو سو روپے کا نوٹ دے کر جیسے حاتم کی دریا دلی کو شکست دے دی تھی۔ جب جھومتی گاتی رقاصہ ان کے ہاتھوں سے روپے اٹھانے آتی تو ساری محفل میں قہقہوں کا شور برپا ہو جاتا اور یہ سعادت نصیب ہونے پر بہت سے لوگ تو ایک دوسرے کو ہی گلے لگا لیتے تھے۔ ان کے عمر رسیدہ چہروں پر وہ خوشی اتنی بناوٹی اور ناگوار لگ رہی تھی جیسے کسی مرد کو زنانہ میک اپ لگتا ہے۔

آس پاس کی چھتوں اور بالکنیوں سے عورتیں کسی حویلی کے میناروں کی طرح سر نکالے ناچ دیکھ رہی تھیں اور نیچے محفل میں بیٹھے ہوئے مردوں کو ان کی موجودگی کا علم تھا۔۔۔ آج کی رات ان کے لئے سب کچھ جائز تھا۔ محفل میں بیٹھے ہوئے تقریباً سب کی بڑی اور رشتہ دار عورتیں چھت پر کھڑی ناچنے والی کا سحر انگیز ناچ دیکھ رہی تھیں لیکن کچھ مرد اپنی عادت سے مجبور ہو کر گردن موڑنے کے بہانے شمع محفل رقاصہ سے نگاہیں ہٹا کر گھر کے مدھم چراغوں پر بھی ایک نظر ڈال لیتے تھے' جن کا سولہ سنگھار کسی بھی طرح اس ناچنے والی سے کم نہ تھا۔

وہ بھی کتنی دیر سے ناچ دیکھ رہی تھی۔ کھڑے کھڑے اس کے پاؤں دکھنے لگے تھے لیکن پھر بھی وہ ہٹ نہیں رہی تھی دوسرے تکتے ہوئے مردوں کی مجنونانہ حرکتیں.......

وہ تو صرف ایک جگہ' ایک نقطے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جہاں فضلو تھا۔ فضلو کی مدھ بھری آنکھیں تھیں' جن کا مرکز رقاصہ تھی۔ فضلو نے سینکڑوں بار ناچ کی محفلیں منعقد کی تھیں اور ہزاروں دفعہ ناچنے والیوں کو دیکھا ہوگا' لیکن اس کی نگاہ محض تماشائی کی نگاہ ہوتی تھی اور آج ان آنکھوں میں پیار کی شراب چھلک رہی تھی حالانکہ وہ دوسرے تماشائیوں کی طرح کوئی بے ہودہ حرکت نہیں کر رہا تھا لیکن خیراں کے دل میں وہ مدھ مست نگاہیں کٹاری بن کر اتر رہی تھیں۔

ریشم جیسے نرم ولویٹ کے کپڑے اور جھل مل کرتا دوپٹہ اوڑھے۔ وہ شام کو دعوت میں اس طرح

مست گھوم پھر رہی تھی جیسے اس کے پیروں میں گھنگرو بندھے ہوئے تھے اور اس کے ہونٹوں پر بار بار گانے کے یہ بول تیر آتے:

"میرا پریتم آئے گا رات کو ری
میں تو کنول چنوں گی کاک (۱) کے

لیکن اب یہ کپڑے اپنی ساری نرمی کھو کر بوری کی طرح کھردرے ہوگئے تھے اور جھل مل کرتے دوپٹے کی چمک آنکھوں میں سوئیاں چبھو رہی تھی۔ آج کی دعوت کا سارا انتظام اس نے اس طرح خوشدلی سے سرانجام دیا تھا کہ خلاف معمول کام کرنے والی مائی بھی اس کی جھڑکیاں سننے سے بچ گئی تھی۔ اس نے ہر مہمان کا اتنی میٹھی مسکراہٹ سے سواگت کیا تھا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ اس بے تحاشہ خوشی کا سبب یہی تھا کہ اس نے آج کی شاندار دعوت میں شہزادی کو مدعو نہیں کیا تھا۔ اڑوس پڑوس کے سارے لوگوں کو بنع کیا تھا اور اپنے تو اپنے دور دراز کے رشتہ داروں کو بھی دور دور سے بلایا تھا۔ وہ چاہتی تو ہمیشہ سے تھی کہ شہزادی کو مدعو نہ کیاجائے اور اگر مدعو کر بھی لے تو نہایت سرسری انداز سے لیکن فضلو ہمیشہ اسے بے نقط سنا کر دل جلا کر چلا جاتا تھا۔ اس دفعہ فضلو اس کے کہنے پر چپ ہوگیا اور اس کو تو جیسے قارون کا خزانہ مل گیا۔ سچ سچ خدا اگر دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ اس کے دل کا ناسور "شمع" تو مرگئی تھی اور شہزادی تو زندہ سلامت ہی اس گھر سے نکل گئی تھی اس سے زیادہ اس کے لئے اس دنیا میں کوئی دوسری خوشی نہ تھی اسی خوشی اور خمار کی اس دعوت میں اس نے کئی اقسام کے کھانے بنوائے کہ لوگ بھی حیران رہ گئے آج اس کو کیا ملا ہے کہ اس نے خزانے کے منہ کھول دیئے ہیں۔ بوڑھی ساس نے تو غصے میں دیگ سے ایک چاول بھی نہیں چکھا تھا اور نہ ہی پھر محفل میں بیٹھی' لیکن اس کی جوتی کو بھی پرواز نہیں تھی۔ "بڑھیا" اس نے کہا تھا "ایسی کتیاں سینکڑوں بھونکتی دیکھیں ہیں" اسی خوشی میں مست جیسے خود اس کے گھنگرو بندھے ہوئے ہوں اور سینکڑوں نغمے اس کے دل سے پھوٹ کر نکل رہے تھے۔ جب اس نے زیتو کی ماں کو بتایا کہ "آج شہزادی کو فضلو نے دعوت ہی نہیں دی' میری تو رب نے جان چھڑا لی ہے اس ڈائن سے۔" تو زیتو کی ماں نے ہنس کر کہا "لیکن شہزادی تو کہتی ہے کہ میرے پیارے ویسے ہی ہیں۔ دوسروں کے بس میں ہیں تو کیا ہوا خیراں چاہیے کچھ بھی کہتی پھرے۔"

یہ سن کر وہ بڑی نخوت سے بولی کہ "اب دل کو یونہی تسلی نہیں دے گی تو اور کیا کرے گی۔"

جب سارے مہمانوں نے کھا پی لیا اور گانے کی محفل منعقد ہوئی تو وہ بھی نوکروں کو کھانا وغیرہ دے کر' مہمانوں کے بستروں کا انتظام کرکے ناچ دیکھنے کے لئے بالکونی میں آئی لیکن فضلو کو مدہوشی سے رقاصہ کو دیکھا پاکر اس کی ساری خوشی فنا ہوگئی سارا دن دعوت کے انتظام کرنے کی جو مصروفیت تھی اس کی تھکن اس پل اسے محسوس ہونے لگی۔

نیچے نیم کے درخت کے قریب موتیے کے گملوں کے بیچ لوگوں کا ہجوم اور بجلی کی طرح چمکتی رقاصہ میں کوئی ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ وہ یہ منظر دیکھ کر بے قرار ہونے کے باوجود وہاں سے ہٹ نہیں سکی اس

کے قریب ہی سے کسی لڑکی نے سرگوشی کی۔

"ماسی.... او ماسی' ذرا سا ہٹ کر کھڑی ہوں تو میں بھی ناچ دیکھوں۔"

لیکن اس کے سارے ہوش حواس تو جیسے رقاصہ کے قدموں تک کھنچے جا رہے تھے۔

جھڑک کر بولی۔

"توبہ........ سارا دن سر کھایا ہے یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔" لیکن جب دیکھا کہ زینو کی ماں کی لڑکی ہے تو بوکھلا کر بولی۔

"تم ہو میں سمجھی کہ میری بھتیجی ہے شاید۔ آؤ آکر دیکھو۔"

آج کی دعوت میں شہزادی کے نہ آنے کا کسی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ ہر کوئی چہ میگوئیاں کر رہا تھا۔ آتے جاتے یہ دیکھ کر اس کے دل کو تقویت سی مل رہی تھی جیسے آب حیات کے گھونٹ لے رہی ہو۔ فضلو اس طرح ہاتھوں سے نکل جائے گا کہ وہ اپنی ایک ہی بہن کو اتنی بڑی دعوت میں نہیں بلائے گا۔ اس کا یقین کسی کو بھی نہیں آ رہا تھا۔ ساری برادری کا کہنا تھا کہ یہ سب خیراں کے جادو ٹونوں کا نتیجہ ہے ورنہ فضلو جیسا لائق فائق تو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ فرمانبردار اتنا تھا کہ صبح سویرے اٹھ کر سب سے پہلے ماں کے لئے چوکی اور پانی کا لوٹا وضو کرنے کے لئے لاکر رکھتا تھا تخت پر مسند بچھاتا پھر ماں کو اٹھاتا "اماں اٹھیں نماز پڑھیں' فجر کا وقت ہوگیا ہے۔" سردیوں میں تو اور بھی جلدی اٹھتا تھا اور بوڑھی ماں کے لئے اسٹوو پر پانی گرم کرتا کہ کہیں ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے بیمار نہ ہو جائیں' اگر اتفاق سے بیمار ہوجاتیں تو اتنی خدمت کرتا تھا کہ سگی بیٹی بھی اتنی نہ کرتی۔ گھر میں لاکھ نوکر تھے شہزادی ان کی خدمت کرنا چاہتی لیکن وہ کسی سے مدد نہیں لیتا تھا۔ راتیں جاگ جاگ کر خدمت کرتا پھر بھی کہتا کہ "ماں جیسی مہربان ہستی کے احسان بھی کہیں اتارے جا سکتے ہیں!" شہزادی سے تو اسے اتنا پیار تھا کہ ہر ماں اپنے بچوں کو اس کی محبت کی مثالیں دیتی تھی۔ فضلو کے ماں باپ بھی ان کی تعریف پر پھولے نہیں سماتے تھے۔ بوڑھا باپ کہتا تھا۔ "میرا فضلو بہت اچھا ہے۔" دوسرے کہتے کہ "اولاد تو سب کو پیاری ہوتی ہے۔" تو وہ بڑے یقین سے کہتا تھا کہ "میرا فضلو غیروں کو اپنا بنانے میں ماہر ہے۔" اور یہ تھی بھی سورج اور چاند کی طرح روشن حقیقت۔ وہ جس طرح نشست و برخواست میں مہذب تھا' ایسا ہی دل کا نیک اور اس کی باتوں میں مٹھاس تھی غریب غربا کے لئے تو رحمت کا بادل تھا۔ محلے میں کسی پر وقت پڑے تو ہر ممکن طریقے سے مدد کرتا تھا۔ شکل صورت شہزادوں جیسی' کھلا ہوا گندمی رنگ' بھنورے جیسی کالی کالی آنکھیں' ماں باپ سے زیادہ دل کا غنی' کھانے پینے کا شوقین' نوابوں جیسی عادتیں۔ فضلو پہلے معمولی سا کلرک تھا لیکن کہتے ہیں خدا کی رحمت دل پر برستی ہے اس لئے اس کی دریا دلی تھی یا ماں کی اٹھتے بیٹھتے کی دعائیں تھیں کہ چند سالوں میں ترقی مل گئی ایک فرم میں نوکری ملی لاکھوں کماتا تھا' لاکھوں لٹاتا لیکن دل وہی حلیم اور نرم۔ ان باتوں کی وجہ سے سب کی آنکھ کا تارا تھا۔

آج جس دعوت میں دیس پردیس کے رشتہ دار جمع تھے ان میں نہ شہزادی تھی نہ فضلو کی بوڑھی ماں

تھی۔ خیراں کا سلوک کسی سے چھپا ہوا تو نہیں تھا ساری دنیا جانتی تھی کہ وہ سارا دن جادو ٹونے کے چکر میں رہتی تھی اور مغرب کے وقت گھر واپس آتی تھی تو اس کی حالت مزدوروں جیسی ہوتی تھی۔ دھول میں اٹے ہوئے پاؤں پسینے میں بھیگے ہوئے کپڑے۔ ویسے تو روزانہ میکے کا بہانہ کرکے رفو چکر ہوتی تھی لیکن ایک دن پول کھل گیا۔ ہمیشہ کی طرح کسی مولوی یا عامل کے پاس سے واپس لوٹی تھی گھر میں گھسی تو ساس نے کہا۔

"دلہن اتنی دیر کہاں رہ گئیں تھیں زیبو نے رو رو برا حال کیا ہے۔"

اس نے برقعہ اتارتے ہوئے شوخی سے کہا "میکے گئی تھی اور کہاں جاؤں گی۔"

اس کا سسر جو کچھ دیر پہلے ہی اس کے میکے سے لوٹا تھا اس نے تعجب سے پوچھا۔

"میں تو ابھی وہیں سے آرہا ہوں تم وہاں تو نہیں تھیں۔" بس پھر تو وہ طوفان مچا کہ اڑوس پڑوس کے لوگ جمع ہوگئے۔ بھڑکے چھتے کو پتھر مارتے ہوئے انسان اتنا نہیں پھنستا جتنا اس عورت کو چھیڑ کر ہر کسی کا حال برا ہوتا تھا۔ بچوں پر ہی بگڑتی تھی تو وہ اول فول بکنے لگتی کہ گھاگ مرد بھی شرمندہ ہو جاتے تھے۔ اس چلن پر اگر کوئی ٹوکتا تھا تو قسمت کا رونا رونے لگتی تھی۔ یہ بات بالکل سچ تھی کہ فضلو کی اس سے بنتی ہی نہیں تھی۔ شادی سے پہلے تو فضلو کو یاد بھی نہیں تھا کہ اس کے خاندان میں خیراں نامی کوئی لڑکی بھی ہے لیکن جب وہ فضلو کا دل کچل کر اس کی دلہن بن کر اس کے پاس آئی تو اس کی نس نس میں خیراں کے لئے نفرت پھوٹ نکلی۔

بچپن سے ہی اس کو شمع سے پیار تھا۔ فضلو اور شمع کی شادی کی باتیں چل رہی تھیں تو خیراں نے چیل کی طرح جھپٹا مار کر اپنے بھائی کے لئے شمع کا رشتہ مانگ لیا۔ صرف اس لئے تاکہ فضلو سے خود اس کی شادی ہوسکے۔ خیراں شکل کی اتنی بری نہیں تھی لیکن اس کی ماں جو سب سے سارا دن لڑتی رہتی تھی اسی کے خون کا اثر اس پر پورا پورا ہوا تھا۔ سگی خالہ تک بہو بنانے پر راضی نہیں تھی کون بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالے۔ جینا ہی حرام کر دے گی۔

ماں اس کو اور تین آفت قسم کے بیٹوں کو چھوڑ کر دوسرے جہان چلی گئی تھی۔ یہ اکیلی لڑکی اس قدر گستاخ تھی کہ پھوپھی خالہ کا ہمدردانہ ساتھ قبول ہی نہیں کیا۔ کسی کا مشورہ ماننے کا تو اس میں مادہ ہی نہیں تھا' جب رشتہ داروں کے اچھے بھلے مشورے نہیں مانے تو ہر کوئی اس سے دور ہوگیا۔ سب سے بڑی بیٹی تھی اس لئے باپ ساری تنخواہ لاکر اس کے ہاتھ پر رکھتا تھا۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر بھائیوں کا اور اپنا جہیز بنایا جب شادی کے قابل ہوئی اور خاندان میں دھڑا دھڑ شادیوں کی دھوم دیکھی تو اسے اپنی اور بھائیوں کی فکر ہوئی۔ لاکھ دفعہ کوئی رشتہ لیتا آخر لڑکی ذات تھی لیکن اس کے ڈھنگ ہی ایسے تھے کہ ہر کوئی دور بھاگتا تھا کیونکہ ابھی تو شادی بھی نہیں ہوئی تھی تب کسی سے نہیں بن رہی تھی' شادی کے بعد کیا کرتی؟

خیراں نے جب فضلو کا رشتہ شمع کے گھر آتے دیکھا تو چالاکی سے خالہ سے اپنے بھائی کے لئے شمع کا رشتہ مانگ لیا اتنی عاجزی سے دوپٹہ اتار کر ان کے پاؤں پر رکھا کہ خالہ بھی اس کی عاجزانہ باتوں میں آگئی اور فضلو کی ماں کو انکار کرکے اس کے بھائی کو اپنی بیٹی دینے کی حامی بھر لی۔ اس کو شمع اتنی اچھی نہیں لگتی

تھی کہ بھابھی بناتی لیکن خاندان کی بساط پر لڑکوں کی شطرنج میں صرف ایک مہرہ فضلو ہی بچا تھا۔ جو اس نے اپنے لئے بچانا چاہا تھا۔ شمع کے تو اوسان خطا ہوگئے تھے۔ خوابوں کی کشتی حقیقت کے کنارے پر لگی ہی تھی کہ خیراں نے مگرمچھ کی طرح اس کی کشتی اوندھی کر دی۔ بات پکی ہونے پر مٹھائی کا آیا ہوا تھال اس نے جوش سے روتے ہوئے پرے کر دیا تھا "بھاڑ میں جائے یہ مٹھائی...... مجھے نہیں چاہیے۔"

تو بھائی نے مرغے کی طرح کڑک آواز میں اسے کہا "شرم کرو بے حیا۔"

شمع خون کا گھونٹ پی کر چپ ہوگئی۔ اس کی آنکھیں آگ برسانے لگیں۔ دل میں آیا کہ کہہ دے کہ میں تو شرم کروں لیکن تم بابا کی نصیحت پیروں تلے کچل کر کمی لڑکی سے بھلے شادی کرو' تم کو سب کچھ جائز ہے اور مجھے کچھ معاف بھی نہیں۔

دراز قد کی شمع کنول کٹوروں جیسی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہاتی سسرال چلی گئی۔

اچانک بجلی گرتی تو بھی اتنا تعجب نہ ہوتا فضلو کو جتنا اب ہوا تھا۔ نہ خیال' نہ گمان سارا جگ سالوں سے سن رہا تھا کہ فضلو اور شمع کی شادی ہوگی۔ قسمت کی لکیریں کس طرح بدل گئیں کوئی نہ جانے کب کون کس کو مل جائے والا حساب ہوا تھا شمع کی شادی ہوئی تو فضلو کا برا حال ہو گیا ماں نے منتیں کرکے اسے خاموش کرایا۔ "عقلمندی کا تقاضا ہے کہ ٹھیک ہو جاؤ میرے بچے اگر اس طرح تم غم لے کر پڑ جاؤ گے تو شمع پر اس کا میاں ظلم نہیں کرے گا تو پھر اور کیا کرے گا؟ بابا! نکاح ہوا اور اختیار ختم۔" لیکن فضلو ویران آنکھوں سے بے انت آکاش کو گھورتا ہوا سوچ رہا تھا ہمارا تو عرش عظیم پر رشتہ جڑا تھا۔ ہم نے اس وقت ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما تھا جب کائنات کا خالق ساری روحوں سے اقرار لے رہا تھا پھر شمع اس دنیا کے میلے میں مجھ سے ہاتھ چھڑا کر کس طرح چلی گئی۔ وہ اس کی شادی میں بھی نہیں گیا یہ بات تو شور و غل میں دب گئی۔ جب شمع کی شادی کے ایک مہینہ بعد بھی فضلو کے غموں کو صبر نہیں آیا تو آس پاس چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ شمع گزرتے ہوئے دنوں کے ساتھ گھلتی چلی گئی چھپ چھپ کر آنسو بہاتی دل پر پتھر رکھ کر مسکراتی تھی۔ میاں کی عقاب جیسی آنکھیں ہر گھڑی اس کا سانس نکالنے کے لئے اس کے چہرے کا طواف کرتی تھیں۔ اس طرح آنسوؤں کو مسکراہٹ کا روپ دیتے دیتے اس کے دل کی ساری قوت ختم ہوگئی۔ انار جیسی رنگت ختم ہو کر بیری کے پتے کی طرح زرد ہوگئی۔ اچھے خاصے خاندانی لوگ شادی شدہ لڑکی کے لئے ایسی ملامت کیسے سہ سکتے تھے۔ ایک ایک نے فضلو کی ماں سے آکر کہا۔ "فضلو کی شادی کرا دو تو شاید کچھ بہل جائے' باقی اس طرح بیٹھا رہے گا تو باتیں کیسے نہیں بنیں گی "نبو" زہر کی پڑیا ہے شمع کو جان سے مار کر رکھ دے گا۔" فضلو کی ماں نے بیٹے سے رو کر کہا۔

"بیٹا' سدا سلامت رہو۔ اس طرح تو کسی کی پگڑی کو یوں پیروں میں نہیں روندتے۔ تم اگر اس طرح اپنے حال خراب کرو گے تو میں شمع کے باپ کے آگے کیا منہ لے کر جاؤں گی!"

فضلو نے درد بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"اماں میں نے تو کبھی کسی کی پگڑی پیروں تلے نہیں روندنی چاہی' نہ ہی پھر میں نے اپنا دل کسی کے

پیروں تلے دینا چاہا تھا جو کچھ ہوا ہے' میں نے تو نہیں چاہا تھا۔ اماں میں نے تو نہیں چاہا تھا۔"

ماں کی آواز ہچکیوں میں گم ہو گئی۔ فضلو چپ چاپ باہر نکل گیا۔

شہزادی کے سمجھانے پر آخر کار فضلو نے شادی کے لئے حامی بھر لی۔ ایک ایک نے آکر فضلو کی ای سے کہا دودھ بھی اپنا شکر بھی اپنی۔ اپنا خون آخر اپنا ہوتا ہے۔ خیراں گستاخ سہی' لیکن آپ کی اپنی ہے۔ ایک ہی تو بیٹا ہے اگر غیروں میں رشتہ کریں گے تو بالکل الگ ہو جائے گا۔ تب اس نے بسم اللہ کرکے خیراں کو اٹھا کر آنکھوں پہ رکھا۔ خیراں کے رشتہ داروں نے بھی وہ عاجزی برتی کہ وہ دل کے سارے دکھ بھول گئے۔ باقی فضلو کو ہوش کہاں تھا کہ ساتھی چنتا!

فضلو کے ماں باپ نے بڑی دھوم دھام سے بیٹے کی شادی کی۔ فضلو جیسے نیند میں چلتے ہوئے شادی کی رسمیں ادا کرکے سیج پر آبیٹھا تو اس کے دل میں سالوں سے محفوظ رکھا ہوا تصور سامنے آگیا۔ سامنے سیج پر زرتار دوپٹے میں شمع نہیں بلکہ خیراں تھی وہ خیراں جس نے اس کو شمع سے جدا کیا تھا۔ اسی وقت اسے اتنا تاؤ آیا کہ سرا نوچ کر پھینکے اور جنگل کی طرف بھاگ جائے لیکن وہ یہ درد پی گیا۔

خیراں چالاک تھی ویسے بھی مکر و فریب میں شیطان کے بعد عورتوں کا نام سنہری حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ دنیا جہاں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ فضلو کو شمع سے پیار تھا اب اگر خیراں اپنی سہیلیوں سے فضلو کی بے رخی کی شکایت کرتی تو اس کا اپنا مذاق اڑتا اور شمع کسی فاتح شہنشاہ کی طرح اس پر ہنستی۔ اس نے فضلو کی بے رخی کا سارا غبار اپنے ساس سسر پر اتار دیا۔

بڑھیا نے اپنی زندگی کے دو چار مقصد بنائے تھے۔ ضرورت مند محتاج کی مدد۔ سارا دن عبادت میں گزارنا اچھا کھانا اور اچھا پہننا بس اور نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ گھر کی حکومت کا کوئی شوق نہیں تھا۔ بہو گھر میں آئی تو سمجھا کہ اب دنیا کے بکھیڑوں سے نجات مل گئی۔ اب اللہ کے حضور حاضری دینے کے زیادہ مواقع ملیں گے۔

اس نے بھرے گھر کی باگ دوڑ بڑی فراخدلی سے خیراں کو سونپ دی لیکن فضلو خیراں کی طرف مائل نہ ہو سکا اور خیراں نے بگڑے بچے کی طرح ساری خوشیاں لات مار کر توڑ دیں۔

شہزادی مہینے دو میں میکے آتی تھی تو ماں باپ سے زیادہ فضلو اس کا سواگت کرتا تھا۔ موسم کا ہر پھل گھر لا کر جمع کرتا تھا۔ شہزادی کے بچے ریڈیو کے عادی تھے اس کے پاس ریڈیو نہیں تھا۔ اس نے فوراً ان کے لئے ریڈیو خریدا' کہنے لگا "ارے بہن کے بچے ننھیال آئیں اور دل بھی نہ بہلا سکیں۔"

بوڑھا باپ کھیتوں سے اناج کے خرار اترواتا تھا تو آدھا شہزادی بیٹی کے گھر باہر سے ہی بھجوا دیتا تھا۔ باغ سے پھل روز خود جاکر اس کے گھر دے آتا تھا۔ شہزادی کا دل بھی ماں باپ سے زیادہ فراخ تھا میاں کی تنخواہ تو کبھی اس نے ہتھیلی پر نہیں رکھی۔ سب کچھ بیوہ ساس کے آگے لاکر رکھتی تھی۔ میکے سے آئی ہوئی چیزیں بھی ساس کے آگے رکھتی تھی پھر بھی اتنی خوش رہتی جیسے کل دنیا کی بادشاہی اسے حاصل ہو۔ حقیقت میں دلوں کی فاتح تو وہ تھی ہی۔ ہر دل میں اس کے لئے بلند مقام تھا۔ وہ سسرال اور میکے دونوں گھروں میں

سکھ کا پیامبر پنچھی تھی۔

خیراں کو یہ ماحول بڑا اجنبی سا لگا۔ اس کے بھائی تو اسے پوچھتے تک نہ تھے' نہ ہی شادی کے بعد باپ نے کبھی پیار سے گھر بلا کر کھلایا پلایا تھا۔

اس کو میکے سے تو محبت نہیں ملی تھی لیکن اس نے جب فضلو جیسے گبھرو جوان کے دل کو بھی اپنی نفرت کی کٹاری سے آدھا کر دیا اور اسے میاں سے بھی عزت و محبت نہیں مل سکی تو اس کے اندر کی عورت ناگن بن گئی۔ وہ بھول بیٹھی کہ دل کی دنیا زور و زبردستی یا حرفت اور چالوں سے فتح نہیں ہو سکتی۔

اب فضلو اس کو لڑنے کا کوئی موقع نہیں دیتا تھا ہر چیز بن مانگے حاضر کر دیتا تھا۔ باقی دل پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا وہ فضلو سے شکایت کرتی بھی تو کس منہ سے' کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کو شمع سے پیار تھا اور وہ خود ہی تو تھی جس نے فضلو کے محبت بھرے دل کو اپنے مطلب پر قربان کیا تھا؟ اپنے کئے کی تو نہ کوئی دوا ہوتی ہے نہ علاج لیکن اس کے اندر سے اٹھتی ہوئی آگ تو کسی کو جلانے کے لئے بے چین تھی۔

جب تک کوئی بچہ نہیں ہوا تب تک اندر کا جوش دبائے وقت گزارتی رہی لیکن جب زیتو پیدا ہوا تو جیسے جنگ کا بگل بج اٹھا۔ اب خیراں کو جب بھی فضلو کے رویہ سے جلن ہوتی تو بچے کی بے تحاشہ پٹائی کرکے دل کا غبار نکالتی۔ بچے کی پٹائی پر بڑھیا کا دل دکھتا تھا۔ کوئی لفظ منہ سے نکالتی کو کہرام سا مچ جاتا کہ راہ چلتے رک جاتے۔ فضلو روز ایک کلو گوشت سبزیاں لے کر گھر بھیجتا تھا' لیکن گھر والی جس نے ساری عمر روکھا سوکھا کھایا تھا' اس کے دل میں اتنی دریا دلی سما ہی نہ سکی۔ اڑوس پڑوس میں وہ گوشت اور سبزی بیچ کر پیسے لے لیتی تھی۔ ساس سسر کو جیسا تیسا دے دیتی لیکن پیالہ بھر سالن اپنے لئے ضرور رکھتی۔ اکلوتے بیٹے کو تھوڑے سے شوربے پر ٹرخاتی۔ کھانے پر اگر جھگڑا ہوتا تو بھری دوپہر میں بیٹے کو بددعائیں دیتی۔ مطلب کہ ہر گھڑی جھگڑے کا پہلو تلاش کرتی رہتی تھی۔ فضلو کا دل پہلے ہی چوٹ کھایا ہوا تھا جینے کی امنگ ہی ختم ہو گئی تھی اس پر گھر میں بھی دو چار گھڑی سکون نہیں تھا تو وہ اور بھی بے زار ہو گیا۔

بوڑھے باپ نے خون پسینے کی کمائی سے گھر اور کھیت بنائے تھے اس کا تو چین و سکون یہاں تک تباہ ہو گیا تھا کہ نہ گھر کی پرسکون روٹی نصیب میں نہ آرام کرنے کے لئے کوئی جگہ' جہاں دوپہر دو گھڑی آرام کر سکے بوڑھی ماں کے درود وظیفے چیخ و پکار میں گم ہو گئے۔ خوشحالی اور دل کی تسکین کے جس پرتو نے ان کے چہرے پر تقدس پھیلایا تھا وہ اب دنیا سے بے زاری اور خفگیوں میں بدل گیا تھا۔ پیٹ بھر کھانا اور تنخواہ نہ ملنے پر ایک ایک کرکے سارے نوکر نکلتے گئے۔ باورچی خانے کا کام بوڑھی ماں کو سنبھالنا پڑا۔

گھر کی ویرانی پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ یہ قول غلط ہے کہ "عورت گھر کی زینت ہوتی ہے" اور یہ عورت زینت تھی یا لعنت؟ البتہ اتنا تو گھر کا کونہ کونہ بھی جان گیا تھا کہ عورت اگر چاہے تو گھر کو بہشت بنائے اور اگر چاہے تو دوزخ۔

لاشعوری طور پر فضلو نے خیراں سے شمع کو جدا کرنے کا بدلہ لیا تھا اور خیراں نے فضلو کی بے رخی کی وجہ سے دل میں جلتی ہوئی آگ پورے گھر پر اچھالی تھی' لیکن اس جھگڑے میں بوڑھے ساس سسر کچل گئے۔

کمہار پر بس نہیں چلا تو گدھے کے کان اینٹھنے والی مثل تھی۔

بوڑھے باپ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اپنے گھر میں اس طرح مہمان بننا پڑے گا۔ کبھی کبھی بیوی پر بگڑ جاتا کہ "تم نے گھر کی باگ ڈور اس ناہنجار کے ہاتھوں میں کیوں دی کہ آج وہ ہمارے کھانے پینے پر ہائے ہائے کر رہی ہے۔ اس کے باپ کی کمائی تو یہاں نہیں ہے اور پھر فضلو کو بھی خدا نے محتاج نہیں دی پھر بھی اس کا ناشکرا پن نہیں ختم ہوتا ہے۔"

وہ جواب دیتی "تمہاری عقل پر کون سے پتھر پڑ گئے تھے کہ میرے اکلوتے بیٹے کو ایسی کم بخت سے شادی کرائی جس کو نہ آنے والے کی شرم ہے نہ جانے والے کی۔"

ہر روز جھگڑے ہوتے' ہر روز مسئلے اسی طرح الجھتے رہتے تھے۔ اب شہزادی میکے آتی تو اول تو خیراں کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ فضلو کی طرف سے دیئے ہوئے آڈر کا توازن بگاڑ دیتی بریانی بنے گی' پڈنگ بنے گی' مرغ بنے گا' مٹی دھول سب بنے گا۔ لمبی لسٹ دیکھ کر اس کا جی جل جاتا۔ "شہزادی کیا وہاں بھوکی رہتی ہے جو یہاں پیٹ بھرنے آتی ہے۔ میاں سیشن جج ہے' لیکن فضلو کا بس چلے تو مہوال کی طرح گوشت نہ ملنے پر اپنی ران پکا کر کھلا دے۔"

موقع ملتا تو وہ مارے جلن کے کسی پڑوسن سے دل کے پھپھولے پھوڑتی اور اگر شہزادی کا اور اس کا کوئی بچہ آپس میں لڑتا تو جنگ کا آغاز ہو جاتا۔ خیراں اسے دل چھیدنے والے طعنے دیتی کہ کھانے کی میز پر شہزادی کے ہاتھ میں پکڑا نوالہ ہاتھ ہی میں رہ جاتا۔ آخر وہ بے زار ہو گئی ماں سے بولی "خدا آپ لوگوں کو جیتا رکھے لیکن میں اس گھر میں نہیں آؤں گی۔ میں نے بھر پایا" اس طرح اس نے آنا چھوڑ دیا فضلو چڑ گیا کتنے دن خیراں سے بات نہیں کی بڑھیا نے رو رو کر حال برا کر لیا' لیکن خیراں کے سر سے بلا ٹل گئی۔ فضلو خود ہی دو ایک دن میں غصہ کے بعد جادو ٹونے سے ٹھیک ہو جائے گا۔

فضلو بہن کو منانے گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا کہنے لگی "سدا سلامت رہو' تم سے تو میری روح جڑی ہوئی ہے نہیں آؤں گی تو میرے دل سے تو نہیں نکل جاؤ گے نا۔ باقی خیراں کو جب اعتراض صرف میرے آنے پر ہے' لینے دینے پر طوفان مچاتی ہے تو پھر کیوں آؤں۔ بھیا میں نے تو اسے کبھی جواب نہیں دیا۔ اماں وغیرہ سے لڑتی ہے ان کو بھی سمجھاتی ہوں کہ کچھ نہ بولیں' بھلے جو چاہیے کرتی رہے۔ وہ کسی سچ اور صحیح بات پر لڑے تو کچھ دے کر اپنی جان چھڑائی جائے' لیکن بے سبب جو اتنا طوفان مچاتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اسے کیا چاہیے؟"

فضلو کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آئی بولا "اری تم نے وہ آگ نہیں دیکھی جو خود کو بھی جلاتی ہے اور دوسروں کو بھی' خیراں بھی اسی طرح ہے۔"

شہزادی نے آنا چھوڑ دیا۔ خیراں کے دل میں آگ اس طرح بھی نہیں بجھ سکی۔ فضلو بہن کے پیار میں اسی طرح پھنسا ہوا تھا اس کا ذکر پہلے سے بھی زیادہ عزت اور محبت سے کرنے لگا تھا البتہ دیکھ دیکھ اور سن سن کر وہ خیراں سے اتنا بے زار ہو گیا تھا کہ اگر کبھی وہ چیختی چلاتی اس کے سامنے بیٹھ کر اس کے باپ کو

بے نقط سناتی تھی' تو وہ چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا' کہنے سے کبھی کچھ فائدہ ہوا ہے۔ اب بیٹے کی خاموشی دیکھ کر ماں باپ کا دل کیسے نہیں دکھتا' اللہ۔ ایک بیٹا جس کو نازوں سے پالا' جس کی وجہ سے سب کچھ سہا اس کی بیوی اس کے سامنے بیٹھ کر ہم کو فحش گالیاں دے اور یہ کچھ نہ کہے لیکن خیراں تو جیسے کسی جن کی اولاد تھی بولتی جاتی اور کسی کے بس میں نہیں آتی تھی۔ پھول جیسے بچے جو ہو بہو فضلو کے ہم شکل تھے۔ ان کو گھر کے اس تند طوفانی ماحول نے اول نمبر کا شیطان بنا دیا تھا۔ راہ گیروں سے لڑائی' غریبوں کو ستانا اسکول نہ جانے کے بہانے الگ کرنا۔ زندگی کی تلخیاں فضلو بچوں کے میٹھے بولوں سے بھولا تا تھا۔ لیکن جب انہوں نے بھی ماں جیسے دل آزار طور طریقے اپنا لئے تو اس کا ان سے بھی دل اٹھ گیا۔

"گھر میں انسان کو سکھ ملتا ہے۔" یہ لفظ فضلو کی زندگی کا سب سے بڑا جھوٹ بن گئے تھے۔ شام کو آفس سے واپس آتے ہوئے اس کا دل مایوسیوں سے بھر جاتا تھا۔ گھر میں گھستا تو وہاں کی فضا اس کے اندیشوں کے مطابق ہوتی تھی۔ اڑوس پڑوس والے شکایت لئے کر آتے کہ "آج زیدو نے میرے دودھ کی بانی میں تھوک دیا۔ نیاز نے میرے بیٹے کا سر پھوڑ کر خونا خون کر دیا۔" اس کا ہمسایہ دوست فتح محمد اٹک اٹک کر کہتا "ارا اپنی بیوی کو سمجھاؤ میری بیٹیوں کو اپنے بیٹوں سے نسبت دے کر گندی گندی گالیاں دیتی ہے تمہاری وجہ سے آخر کوئی کہاں تک سہے گا۔"

سن سن کر فضلو کا خون ابلنے لگتا دل سے آہ نکل جاتی تھی۔

اف کون سے گناہ کی سزا میں یہ جیون ساتھی نصیب ہوا ایسی بہی پیدا کرنے سے تو اچھا تھا اگر ساس کی کوکھ جل جاتی جس نے خود کو تکلیف ہی دی لیکن اولاد بھی ایسی پیدا کی جیسے تھوہر کا درخت۔

اگر بابا آدم مل جائے تو اسے کہوں ایسی عورت کے لئے تم نے رب تعالیٰ کو اپنی پسلی سے گوشت نکال کر دیا تھا۔ تم نے بہشت میں دل بہلانے کے لئے ساتھی مانگا تھا لیکن مجھے تو اس عورت نے دنیا میں ہی دوزخ کا مزہ چکھا دیا ہے۔

قیامت کو پتہ نہیں کس کا انتظار تھا لیکن ان کے گھر تو شاید قیامت آچکی تھی'جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ گھر کی صورت وہی بے ڈھنگی رہی پھر خیراں کا رونمنا بھی ہر وقت ہی ہوتا تھا۔ فضلو بچوں کو یاد کرتا تھا۔ وہ بھی ننھیاں میں نہیں ٹکتے تھے۔ بھاگ کر اسی کے پاس واپس آتے تھے۔

خیراں نے یہ اچھا نہیں کیا تھا۔ دور دور سے لوگ آکر جمع ہوئے تھے' لیکن نہ تو شہزادی کو دعوت ملی نہ بڑھیا ساس کو' کون آیا کون نہیں آیا' فضلو کو ہوش نہیں تھا اس کا اور نہ ہی پھر دلچسپی اس دعوت میں اس نے صرف اتنا حصہ لیا تھا کہ دوسرے شہر سے رقاصہ دلشاد بیگم کو بلایا۔

خیراں کے لئے حالانکہ یہ نئی بات نہیں تھی' لیکن جیسے گرما کی دھوپ روز روز دیکھنے کے باوجود برداشت نہیں ہوتی۔ اس طرح فضلو کا ایک خوبصورت رقاصہ کو بلانا خیراں کو پسند نہیں تھا۔

جیسے جیسے رات گزرتی گئی ویسے ویسے فضا بھیگتی گئی۔ اس سے رقاصہ کا اپنی مدھر آواز میں گانا۔

ہمیں تو آج کی شب پو پھٹنے تک جاگنا ہو گا

ہمیں پہ رات بھاری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

لیکن آج کی رات تو شاید سب پہ بھاری تھی۔ اس محفل سے تھوڑی دور شہزادی اپنے گھر میں لیٹی سوچ رہی تھی۔ "ایک بھائی تھا وہ بھی ڈائن نے جدا کر دیا۔ خدا کا دیا میرے پاس سب کچھ ہے۔ میں کیا اس سے چھین رہی تھی کہ اس کو جلن ہوتی ہے۔ بڑھیا ساری رات سو نہ سکی آنکھوں میں نیند نہیں تھی تو پیٹ میں کھانا نہیں تھا۔ جس کھانے کو میری بچی نہ کھا سکے وہ میں کیسے کھاؤں۔ آدھی رات کو اٹھ کر جائے نماز بچھا کر تہجد پڑھنے کھڑی ہوئی تو تسبیح کے دانوں کے گرنے سے پہلے دس دس آنسو اس کی ضعیف آنکھوں سے گرنے لگے "دو دانے خدا نے دیئے وہ بھی اس نے جدا کر دیئے ہائے۔ میرا اکیلا فضلو........"

فضلو بے قرار تھا۔ سالوں کی دبی ہوئی چنگاری پر سے رقاصہ نے راکھ اڑا دی تھی۔ اس کی بائیں آنکھ کے قریب کالے تل نے اس کے دل میں پرانا پیار جگا دیا تھا۔

کتنی مشابہت تھی شمع اور رقاصہ میں...... وہی کجلی آنکھیں' وہی ہرنی جیسی چال اور خیراں جیسے انگاروں پر لیٹی ہوئی تھی۔ سارے دن کام کی وجہ سے بدن کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا' نیند کے لئے خواہاں تھی لیکن ذہن میں جیسے بتی جل رہی تھی...... فضلو تو پہلے کبھی بھی کسی غیر عورت کو اس طرح گھور کر نہیں دیکھتا تھا' آج اسے کیا ہو گیا ہے۔

صبح فجر کے وقت اس کا بیٹا زیو جمائیاں لیتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ راگ کی محفل ختم ہو چکی تھی۔ خیراں نے اپنی ساری نفرت لفظوں میں ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ فاحشہ عورت گئی۔"

"ہاں بابا اسے چھوڑنے گیا ہے۔"

"اکیلی تھی کیا؟ کیوں وہ اسے چھوڑنے گیا ہے۔ اندر کہہ کر بھی نہیں گیا۔" اس نے چڑ کر کہا۔

"مجھ سے کہہ دیا تھا...... تم سے آکر چھٹی لیتا کیا؟"

بیٹے نے جھڑک کر کہا اور لیٹ گیا۔

پھر کئی سورج ابھرے کئی چاند چمکے فضلو واپس نہیں آیا۔

کاک ۔ سندھی لوک کہانی "مومل رانو" مومل کے محل کا نام

عبدالجبار جونیجو

تتلی

اصل نام تو کچھ اور تھا' مگر سب اسے تتلی کے نام سے پکارتے تھے۔

گھر کی سیڑھیاں بہت کم تھیں۔ مگر تتلی چونکہ مشکل سے ڈیڑھ دو سال کی تھی۔ اس لئے جب ماں کی بے خبری میں سیڑھیاں اترنے کی کوشش کرتی تو گھر کے سامنے کریانے کی دوکان والا چاچا خیرو بھاگ کر آتا اور تتلی کو پکڑ کر دروازے کے اندر کرتا اور دروازہ بند کر دیتا۔ ابھی وہ کسی گاہک کا سودا تول رہا ہوتا تو وہ پھر دروازہ کھولے نیچے اترنے کی کوشش کرتی نظر آتی۔ وہ پھر سودا چھوڑ کر بھاگتا ہوا تتلی کو پکڑتا اسے گھر کے اندر کر کے پھر دروازہ بند کر دیتا۔ دن میں نا جانے کتنی بار اسے ایسا کرنا پڑتا۔

پھر اس نے تتلی کو چلتے ہوئے دیکھا۔ اسکول جاتے دیکھا۔ اس نے تتلی کے میٹرک میں پاس ہونے کی مٹھائی بھی بانٹی۔ وہ بہت خوش ہوا تھا مگر دل میں ایک خواہش بھی تھی کہ تتلی کالج نہ جائے۔ پردہ کرے' گھر کے اندر رہے اور اپنے بڑوں کی پیروی کرے۔

چاچا خیرو بھی عجیب آدمی تھا۔ جو پرائی اولاد سے اتنا پیار کرتا تھا۔ وہ پرانے خیالات کا آدمی تھا۔ یوں تو تتلی کے رشتہ دار بھی پرانی روایت پر چلنا پسند کرتے تھے مگر زمانے کی رفتار دیکھ کر وہ بھی چپ تھے ابھی وہ اس مسئلے پر سوچ ہی رہے تھے کہ تتلی کو آگے پڑھایا جائے یا نہیں کہ تتلی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ باپ سے کہنے لگی کہ زمانے کی رفتار کے ساتھ چلنا چاہیے۔ میں جاہل رہنا نہیں چاہتی پھر چاچا خیرو کس گنتی میں تھا۔ اس نے ابھی خود کو ذہنی طور پر تیار بھی نہیں کیا تھا کہ اس نے تتلی کو کالج جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ اب بھی برقع اوڑھتی تھی' مگر اس کا برقعہ نئے ڈیزائن کا تھا۔ جب وہ گلی سے گزرتی تو اس کے برقعے کی طرف ضرور دھیان جاتا کل کی خبر چاچا خیرو کو بھی نہیں تھی کہ کیا ہو گا۔ شروع شروع میں کالج جاتے تتلی کے طور طریقے میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ لباس بھی کچھ زیادہ فیشن زدہ نہ تھا لیکن رفتہ رفتہ بات آگے بڑھی۔ قدامت پسند لڑکیاں اور لیکچررز اسے زیادہ پسند نہیں تھیں اور تتلی ان لڑکیوں کو نا پسند کرتی تھی جو خوبصورتی اور فیشن میں اس سے آگے تھی۔ ادھر چاچا خیرو تھا۔ خوامخواہ دل ہی دل میں جلتا رہتا تھا۔ اس نے پرائی لڑکی کو اپنی لڑکی سمجھ کر خود کو مصیبت میں ڈال رکھا تھا۔ ماضی کی باتیں اسے یاد آتی تھیں۔ تتلی کالج جاتی تو اسے اتنی خوشی نہیں ہوتی تھی لیکن وہ اس کا بچپن یاد کرکے خوش ہوتا تھا۔ اب وہ ہر وقت خیالوں میں ڈوبا رہتا گاہک آتے تھے چینی کے بجائے نمک تولتا۔ گاہک چلاتے کہ نشہ تو نہیں کیا ہے تو وہ جیسے نیند سے بیدار ہو جاتا۔

پنکی کالج جاتی تو بعض نوجوان راستے میں لڑکیوں پر آوازے کستے ہوئے ملتے مگر وہ سر جھکائے ادھر ادھر دیکھے بغیر گزر جاتی۔ اسے اس کی فکر نہیں تھی کہ کون کھڑا ہے۔ وہ تو صرف اپنے راستے پر چلنا پسند کرتی تھی مگر ان لڑکوں میں سے ایک لڑکا اس کا پیچھا کرتا تھا جب وہ گلی سے نکل کر سڑک پر آتی۔ تو وہ پتھر کی طرح ساکت کھڑا اسے دیکھتا رہتا تھا۔ ذرا آگے چلتی تو پتھر میں جیسے جنبش ہوتی تھی اور وہ اس کے پیچھے سائے کی طرح چلنا شروع کر دیتا۔ ایک فرمانبردار نوکر کی طرح پیچھے پیچھے کالج تک آتا تھا۔

پہلے پہل تو پنکی نے خیال نہیں کیا کیونکہ وہ لڑکا اس سے خاصا دور ہوتا تھا مگر کبھی کبھی کھٹک جاتی تھی۔ اس نے اس کا ذکر اپنی کلاس فیلو شازیہ سے کیا۔ پنکی اور شازیہ دونوں گہری دوست تھیں۔ شازیہ ایک امیر باپ کی لڑکی تھی۔ دیکھنے میں پنکی سے زیادہ اچھی تھی۔ اس کی دوستی میں آنے کے بعد پنکی بھی اپنا رنگ بدلنے لگی تھی اور سال کے آخر میں سچ مچ پنکی بن گئی تھی۔ اب وہ خود کو شازیہ کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے قابل سمجھنے لگی تھی۔ پنکی کا باپ شازیہ کے باپ سے مالی لحاظ سے کم تھا مگر ان دونوں کی دوستی میں یہ بات حائل نہیں تھی۔ دوستی اسی کو کہتے ہیں کہ کھلے دل سے دوست کو چاہو۔ وہ عاقل و دانا جو اب قبروں میں سو رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ تم کو نہ چاہے تب بھی تم اسے چاہتے رہو لیکن اگر ایسے عاقل و دانا اس مشینی دور میں ہوتے تو شاید آج اپنی رائے بدل دیتے کیونکہ نہ چاہے جانے کے باوجود بھی چاہے جانا' اب ناممکن تو نہیں مشکل ضرور ہے۔ ایسا کرنے کے لیے خود کو ہزار بار مارنا پڑتا ہے۔ ان دونوں سہیلیوں کے خیالات کچھ ایسے ہی دائروں میں قید تھے شازیہ کوئی بات بھی کرتی پنکی اس کو فلسفے کا لبادہ اڑھا دیتی۔ ہر بات کا نفسیاتی جائزہ لیتی گو شازیہ کو فلسفہ اور نفسیات کچھ زیادہ سمجھ میں نہیں آتے تھے مگر وہ ہاں میں ہاں ملاتی رہتی تھی۔ اکثر پنکی انسانی بندھن اور رشتوں ناتوں پر شازیہ کو بڑے بڑے لیکچر دیتی۔ شازیہ ان میں سے کچھ تو ہضم کر جاتی تھی' کچھ فلسفہ صرف اس کے سر پر سے گزر جاتا تھا۔ شازیہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پنکی یہ باتیں کہاں سے سیکھتی ہے۔ ایک دن اس نے پنکی سے پوچھا۔ "یہ سب باتیں تمہیں کون بتاتا ہے۔"

"کتاب۔"

"صرف کتاب۔" شازیہ نے پوچھا۔

پھر اس نے سوچنے اور فکر کرنے کے بارے میں بتایا۔ یہ باتیں شازیہ کو سمجھ تو نہیں آئیں وہ خاموشی سے سنتی رہی' یوں تو وہ بھی خاصی ذہین تھی مگر اسے یہ باتیں سمجھ نہ آتی تھیں۔

ایک دن پنکی کا پیچھا کرنے والے نوجوان نے کچھ ہمت کی اور پنکی کو سلام کیا۔ پنکی کو وہ سلام اتنا برا نہ لگا کیونکہ اس دوران وہ بہت سے ناول کہانیاں اور شاعری پڑھ چکی تھی۔ وی۔ سی۔ آر بھی دیکھ چکی تھی۔ سلام کے بعد سلسلہ کچھ اور آگے بڑھا تو پنکی کے جذبوں کے سمندر میں لہریں سی اٹھیں۔ اس نے شازیہ سے ساری باتیں کہہ دیں۔ شازیہ کو پنکی کی شخصیت میں نئی جاذبیت سی محسوس ہوئی۔ اس نے پنکی سے ایک لمبا چوڑا انٹرویو لیا جس میں نفسیاتی' جذباتی' سماجی بلکہ سیاسی خیال بھی ظاہر ہوتے تھے۔ ایسا ہی ہوا اور اب اس کے لیے پنکی ایک واضح شخصیت میں ظاہر ہو گئی۔ ملاقاتیں بڑھتی گئیں اور ہر ملاقات کی رپورٹ شازیہ کو ملتے

گئی۔ بات یہاں تک پہنچی کہ چکی اور ارسطو کے درمیان شازیہ ایک اہم کردار بن گئی۔ ارسطو نے شازیہ کو چھوٹی سالی کا درجہ دے دیا۔ وہ اس اعزازی عہدے پر خوش تھی اور ابتدا میں اس نے اپنے عہدے کی حد سے آگے بڑھنے کا سوچا بھی نہیں تھا۔ بظاہر چکلی راضی تھی مگر آہستہ آہستہ جب ارسطو سے شازیہ کی بے تکلفی بڑھ گئی تو شازیہ کے انداز بھی بدل گئے۔ چکی نے شازیہ سے اس کا اظہار تو نہیں کیا مگر اس نے غیر محسوس طور پر بے چینی محسوس کی۔

دانا کہتے ہیں کہ عشق و مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ خاص کر کے جب مشک بکھرا دیا جائے داناؤں کی بات اور ہے بے وقوف بھی تو یہی بات کہتے ہیں۔ ان ہی بے وقوفوں سے داناؤں نے یہ سب سیکھا ہے۔ غرض چکی اور شازیہ کی دوستی کی عظیم الشان عمارت میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئیں وہ دراڑیں ابتدا میں ایسے نظر آئیں جیسے کسی دیوار میں پہلے کوئی دراڑ نظر آئے اور آہستہ آہستہ وہ دراڑ بڑھتی جائے۔ اس کا اظہار چکی نے ایک دن ہنسی ہنسی میں کیا۔ شازیہ نے بھی ہنسی ہنسی میں جواب دیا۔ مگر چکی کو احساس ہو گیا کہ یہ ایک ایسی دوڑ ہے جس میں تیز بھاگنے والا ہی آگے نکل سکتا تھا۔ چکی کو محسوس ہوا کہ جو باتیں ساتھی اعتبار سے زیادہ وقریب تھیں ان میں سے بہت سی باتیں چکی میں نہیں تھیں۔ لیکن شازیہ میں موجود تھیں۔ شازیہ نے چکی کے دل کا کوئی خاص خیال نہیں کیا بلکہ ایک دن ہنستے ہنستے صاف کہہ دیا کہ "دوڑ جیتنے میں اپنی اپنی صلاحیت کا دخل ہوتا ہے۔ تم میں اگر میرے سے زیادہ صلاحیت ہے تو اب بھی بازی تم جیت سکتی ہو۔" چکی کا فلسفہ اگر یہ بازی جیت سکتا تو شازیہ کو کوئی اعتراض نہیں تھا مگر اب گیند دوسری کورٹ میں تھی۔ چکی کی حالت ہارے ہوئے جواری کی طرح تھی۔ وہ اپنی پیاری سہیلی سے ہار چکی تھی۔ ایک ایسی ہار جس کو پڑھی لکھی لڑکیاں بہت دیر تک قبول نہیں کرتیں۔ اگر مجبوراً قبول کر بھی لیں تو یہ چوٹ سہہ نہیں سکتیں' نہ صرف نروس ہو جاتی ہیں بلکہ غصہ ان کی طبیعت کا حصہ بن جاتا ہے اور وہ اپنی پرچھائیں سے بھی لڑنے لگتی ہیں۔ اپنی پسند کی خوشبو بھی بدل دیتی ہیں۔ مطالعے کا شوق بھی بدل جاتا ہے۔ چکی میں بھی لاشعوری طور پر ایسی ہی تبدیلیاں رونما ہو گئیں۔ اس کے شب و روز بدل گئے۔ شازیہ بی۔اے میں فیل ہو گئی۔ اب اس کی کہانیاں ان دونوں سے آگے پھیل کر اس کے محلے کے درودیوار سے ٹکرانے لگیں تھی۔ نوجوانوں کا اہم موضوع یہی تھا۔ اب تک بات شازیہ کے محلے تک محدود تھی۔ چکی کے محلے میں نہیں پہنچی تھی۔ اگر پہنچتی تو چاچا خیرو پانچ سیر کا باٹ لیکر ارسطو کا سر ضرور توڑ دیتا۔

کہانی کا انجام چونکا دینے والا نہیں تھا جیسا کہ ہونا چاہیے تھا۔ کہانی کا آغاز اور درمیانی حصے سے انجام کی خبر ہو جاتی ہے' جبکہ انجام سے لوگ اکثر بے خبر ہوتے ہیں۔ تب تو لوگ پانی کو پانی اور طوفان کو طوفان نہیں سمجھتے جب سر پر آپڑتی ہے تو پھر قسمت کو کوستے ہیں اور اکثر اسی رونے دھونے میں اصل مجرم کے بجائے راہ چلتے بے گناہ کو پکڑ کر مجرم گردان دیا جاتا ہے مگر چکی نے ایسا نہیں کیا۔ ارسطو نے شازیہ کا رشتہ مانگا۔ چکی نے بھی سنا شازیہ کے گھر والوں نے غریب لڑکا دیکھ کر انکار کر دیا۔ یہ بھی چکی نے سنا۔ شازیہ نے خودکشی کی دھمکی دی یہ بھی چکی نے سنا۔ شازیہ کی دھمکی سے اس کے گھر والوں نے ڈر کر رشتہ منظور کر

لیا۔ یہ بھی تِلی نے سنا۔ اس کو ان باتوں میں خوشی یا غم کا اظہار کرنے کا کوئی پہلو نظر نہیں آیا۔ البتہ چاچا خیرو کو تِلی کے دکھ کی خبر دیر سے ہوئی جب پہلی دفعہ اس نے دیکھا کہ تِلی گھر واپس آ رہی تھی تو اس کا پرس اس کے ہاتھ میں ناچ نہیں رہا تھا۔ وہ کھوئی کھوئی سی تھی۔

یہ شازیہ اور ارسطو کی شادی کی رات تھی۔ دعوت اور بلاوے پر بھی تِلی نے شادی میں شرکت نہیں کی۔ پورے ہفتے اس کی حالت خراب رہی۔ آخر وہ گھر سے نکلی اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔

بات کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ مگر وقت اپنی رفتار سے گزرتا ہے۔

ایک شام چاچا خیرو کے ہاتھ سے گمی کی پیالی گرتے گرتے بچی۔ اس نے دیکھا تِلی کے ہاتھ میں پکڑا ہوا پرس ایک بار پھر رقص کر رہا ہے شوخی سے چلتی ہوئی وہ پرانی تِلی لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ اس نے جغرافیہ نہیں پڑھا تھا۔ اس نے سوچا یہ دنیا کتنی وسیع ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے زمین گردش کر رہی تھی۔ ایک مسلسل گردش جس نے اسے بھی گھیر لیا تھا۔

عبدالقادر جونیجو

قلعے کی دیوار

اللہ رکھے سائیں محمد خان رئیس ابھی نو عمر تھا تو وہ دوسری بات تھی مگر وہ کسی ایسے ویسے گھر میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کا باپ چھ فٹ کا گھبرو اور وجیہہ شخص تھا۔ اس کا خاندان تو سات پشتوں سے چٹان کی طرح اس علاقے میں جما ہوا تھا۔ آس پاس کے بڑے بڑے وڈیروں نے اس خاندان کو اکھاڑ پھینکنے کی بارہا کوشش کی' یہ مضبوط چٹان تو اپنی جگہ سے نہ ہلی' مگر ہر کوئی خود کو زخما کر ہانپتے کانپتے تھک کر بیٹھ گیا اور ان کی آنے والی نسلیں بھی اس کشمکش میں ماضی کا حصہ بن گئیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس خاندان کے اجدا بڑے گنی لوگ تھے۔ انہوں نے زندگی کے اکھاڑے میں جس پر بھی ہاتھ ڈالا' اسے سر کے بل دے مارا' جو سامنے آیا پٹ گیا۔ اس طرح وہ اپنی آنے والی نسلوں کے لیے راہ ہموار کر گئے۔ پھر یوں بھی یہ خاندان مالی طور پر کمزور نہ تھا۔ اتنی زمین تھیں کہ گھوڑے دوڑتے رہیں اور ختم نہ ہو۔ دہشت کا یہ عالم کہ علاقے بھر میں مشہور تھا کہ ان لوگوں کو زبان ایسی ہے۔ جیسے کالے ناگ کا پھٹ ہو۔ شامت کا مارا کوئی بدنصیب ان کے زیرِ عتاب آجاتا ہے تو ایسی بات کہہ دیتے ہیں کہ زہر ان کی آنے والی سات نسلوں تک کے دل کھاتا جاتا ہے۔

اللہ رکھے سائیں محمد خان کو جس کے والد مرحوم کے پاس جتنی زیادہ جائیداد تھی' زندگی اتنی ہی کم۔ اس نے جوانی کا دروازہ ابھی پھلانگا ہی تھا کہ یک دم زندگی کے باقی راستے بھی پھلانگ گیا مگر جاتے جاتے اپنی دونوں بھری ہوئی مٹھیاں محمد خان کی جھولی میں خالی کر گیا۔

رئیس محمد خان ابھی نو عمر تھا مگر امیر گھرانے کا بچہ تھا۔ بڑا ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ نوکرانیوں اور نوکروں کی گودوں میں کھیلتے کھیلتے جوان گھبرو مرد بن گیا۔ جوانی بھی ایسی کہ لوگ دیکھتے رہ جاتے۔ بڑا ہوا تو سب نے ہاتھ کھینچ لئے۔ جیسے چٹان کا ٹکڑا تھا جو دوبارہ زمین سے جا لگا ہو بچہ تو نہیں تھا کہ اب بھی ملازم گود میں لئے رہتے۔ اس کے لئے اس کی جائداد اور زمینوں کی گود ہی کافی تھی اور کیا چاہیے تھا۔

مگر جب جوانی آئی تو اس کے پور پور سے ایک بے چینی پھوٹ نکلی تب اسے اچانک محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے اس کے گھر اور قلعے کی دیواریں سانس نہیں لے رہی ہیں۔ ان سے دھڑکن سننے کی کوشش کی۔ ایک دو بار اس نے اپنے کمرے کی دیواروں پر ہاتھ رکھ کر ان میں زندگی کو محسوس کرنا چاہا مگر سب بے جان تھیں۔ چنانچہ اس نے قلعے کی دیواریں' کھیتوں میں کھڑی فصلیں اور حساب کتاب کے رجسٹر دیکھنے کے

بجائے لوگوں کے چہروں کو دیکھنا شروع کیا اور چہروں پر بکھرے رنگوں میں ڈوب گیا۔ خود اس کے چہرے پر قلعے کے باہر کی دنیا کے کئی رنگ چڑھ گئے اور وہ ان رنگوں کی موجوں میں تنکے کی طرح بہنے لگا تھا۔

اس دن رئیس کا ڈرائیور جیپ کے پرزے لانے حیدر آباد جانے لگا تو محمد خان بھی نہایت خاموشی کے ساتھ حیدر آباد جانے کے لیے تیار ہو کر جیپ میں بیٹھ گیا۔ کون روکتا؟ اپنی مرضی کا مالک تھا۔ اس نے سوچا اس علاقے سے باہر کے لوگوں کو بھی دیکھنا چاہیے اور کچھ نہیں تو کم از کم اتنے بڑے شہر میں رہنے والے بہت سے رنگ روپ والے لوگوں کے چہروں کے رنگ تو دیکھ سکوں گا۔

ڈرائیور نے گردن جھکا کر جیپ میں چابی گھمائی۔ ابھی جیپ نے رینگنا شروع ہی کیا تھا کہ پیچھے سے کمدار (منشی) نے آواز دی "روکو جیپ روکو۔" اور دوڑتا ہوا جیپ کے پچھلے حصے کی زنجیر پکڑ کر جیپ کے ساتھ لٹک گیا۔ اس کی لمبی لاٹھی ہاتھوں سے چھوٹ کر اس کی بڑی سی شلوار میں پھنس گئی۔ آواز سن کر ڈرائیور نے بریک لگا دی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو جیپ کے پچھلے شیشے سے کمدار کا سہا اور ہانپتا ہوا چہرہ نظر آیا۔

"کیا ہے۔"

"کیا تم بے ہوش ہو کر گاڑی چلاتے ہو۔" کمدار ہانپتا کانپتا پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔

"میں چیخ چیخ کر تھک گیا کہ روکو' روکو یہ آواز ہی نہیں سنتے' مگر تم لوگوں کا بھی قصور نہیں۔ رئیسوں کے برابر بیٹھتے ہو۔ توبہ توبہ اللہ پناہ دے۔ آج تو میرے دن جیسے پورے ہو گئے تھے۔"

"تم بھی تو کمال کرتے ہو' چلتی جیپ میں کیوں چڑھ رہے تھے۔"

"مجھے گھر کی طرف سے ہدایت ہے کہ چھوٹے رئیس کو اکیلا کہیں نہ جانے دوں ابھی کم عمر ہیں۔ شہر میں بلا گالا لگا ہوا ہے۔"

"اچھا اب چلوں یا اب بھی کوئی کام ہے۔"

ڈرائیور نے دوبارہ چابی گھمائی۔

"ٹھہرو ابھی کیسے چلو گے دو تین لوگ اور بھی آرہے ہیں۔ چھوٹے رئیس کو اللہ بڑی عمر دے۔ ساری دنیا جانتی ہے۔ لوگ یہ نہ کہیں کہ جیپ میں صرف ڈرائیور اور کمدار بیٹھے ہیں۔ یہاں دشمن بھی ہیں کوئی ہتھیار بند بھی ساتھ ہونا چاہیے۔"

دن ڈھلے جب وہ حیدر آباد پہنچے' تو سورج ڈوب رہا تھا۔ شام کے سنہرے موسم میں پرزوں کی دوکان کے سامنے لوگوں سے بھری جیپ میں بیٹھے محمد خان کو سامنے والے شیشے سے فٹ پاتھ پر آتے جاتے بے شمار چہرے نظر آرہے تھے۔ بجھے ہوئے دھواں دھواں چہرے' زندگی کے خون سے دمکتے چہرے' اکیلے چہرے' جوڑا جوڑا چہرے' ہاتھ میں ہاتھ دیے اور بازو کندھے پر رکھے آپس میں لپٹتی ہوئی مسکراہٹ' مسکراہٹوں سے چھوٹی چھوٹی باتوں کے گرتے ہوئے پھول۔ فٹ پاتھ سے نظر ہٹا کر پیچھے جیپ میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر نظر ڈالی جن کے چہروں پر مسکراہٹ کا کوئی بھی پھول نہیں تھا۔ سامنے لگے شیشے سے باہر دیکھا جیسے اسے کسی اپنے کی

تلاش ہو۔اپنے آپ کی تلاش ہو۔ اس کے سر پر کسی کا بھی ہاتھ نہیں تھا' نہ پیروں کے نیچے زمین تھی۔ وہ اس طرح اکیلا تھا جیسے سفید رنگ کی بدلی کا کوئی ٹکڑا سردیوں میں آسمان کی ڈستی ہوئی نیلاہٹ کی موجوں میں نقطے کی طرح ڈوبتا تیرتا نظر آتا ہے اور ہوا چاروں طرف چیختی پھرتی ہے۔

شام کے دھندلکے میں حیدر آباد کی اس روشن سڑک سے لیکر گاؤں واپس آنے تک جیپ میں ایسی خاموشی تھی جیسے اس میں بیٹھے سبھی لوگ پچھلے پہر کی طرح ویران ہوں۔ خاموشی کے اس جبر سے محمد خان کی روح پر اندھیرے سائے وار کرنے لگے۔ باہر ہوا کی سرگوشیاں اس کے اندر تلاطم برپا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ٹھنڈی سانس لی۔ جیسے وہ ان سایوں کو ہٹا رہا ہو۔ جمائی لینے کے لئے دائیں بازو کو اوپر اٹھایا پھر اسے ڈھیلا چھوڑ دیا جو ٹوٹی ہوئی ٹہنی کی طرح ڈرائیور کے کندھے پر پڑا۔ ڈرائیور اس اچانک صورت حال سے گھبرا گیا۔ گاڑی اس کے قابو سے باہر ہو کر لڑکھڑانے لگی۔ بے خیالی میں اس کا پاؤں بریک پر جا پڑا اور گاڑی ایک طویل چرچراہٹ کے بعد سڑک کے ایک طرف کھڈے میں گرتے گرتے بچی اور رک گئی۔ سب کے جسموں میں سنسناہٹ سی بھر گئی۔ محمد خان نے ڈرائیور کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"بادشاہ آپ نے تو جان نکال دی تھی۔"

ڈرائیور کو پسینہ آگیا تھا۔

"کیوں؟"

"سائیں آپ نے بازو میرے کندھے پر جو رکھ دیا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"سائیں کہاں آپ اور کہاں ہم' آپ کے نوکر' کسی غریب کو گناہ گار تو نہ کریں۔ کل دنیا بھی یہ کہے گی کہ نوکروں کا اتنا دماغ خراب ہوا ہے کہ مالک کے کندھے سے کندھا ملا کر چل رہے ہیں۔ آپ کی تو کوئی زمیندار بھی برابری نہیں کر سکتا اور ہم تو آپ کے نوکر ہیں۔"

محمد خان کو محسوس ہوا جیسے بریک جیپ کو نہیں اس کے اپنے احساسات کو لگ گئے ہوں اور اس کے سارے احساسات ایک جگہ منجمد ہو گئے ہوں۔ اس نے ایک نظر ڈرائیور کو دیکھا اور پھر سے دوڑتی جیپ کے ساتھ ہلکور کھانے لگا۔

دوسری صبح جب وہ اپنی خمار آلود آنکھوں کے ساتھ اپنے کمرے سے نکلا اور بے مقصد برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے تک نظریں دوڑائیں' تو اچانک وہ چونک گیا۔

اس کے پاؤں جہاں تھے وہیں تھم کے رہ گئے۔ اس کی نگاہیں جھاڑو دیتی "خاناں" کے پیروں سے ہوتی ہوئی اس کے چہرے پر سردی کی طرح جم کر رہ گئیں۔ اسے اچانک یوں لگا جیسے گھر کی دیواریں سانس لینے لگی ہوں اور اس کے پیر زمین پر لگ گئے ہوں۔ اس کو اپنے سر پر خوبصورتی کے ہاتھ محسوس ہونے لگے وہ خاصی دیر خاناں کو یوں ہی دیکھتا رہا۔ خاناں نے جب رئیس زادے کو اپنی طرف دیکھتے پایا تو اپنے جسم میں

چیونٹیاں سی رینگتی محسوس کرنے لگی۔ اس کے ہاتھ کانپ گئے۔ اس نے وسوسوں سے بھری آنکھیں اٹھا کر محمد خان کو دیکھا اور پھر گردن جھکالی۔

اس کے حواس گم ہو گئے۔ آسمان جیسا بڑا آدمی گردن اٹھائے اس کے قریب کھڑا تھا جائے تو کہاں جائے۔ وہ زمین میں گڑتی گئی۔

"سائیں ذرا۔۔۔۔" خاناں کے الفاظ ساتھ چھوڑ گئے۔

"ہی؟" خیالوں کے ساگر میں بہتے اچانک وہ رک گیا۔

"کپڑے خراب ہوتے۔۔۔۔۔۔۔ مٹی" اس کی آواز پھر کانپ گئی۔ الفاظ ادھورے رہ گئے۔

"ہی؟" وہی بے خیالی میں ڈوبی آواز۔

"جھاڑو لگانے سے مٹی اڑے گی۔ آپ کے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔"

"پھر کیا ہو گا؟"

"ہو گا تو کچھ بھی نہیں۔" اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "آپ تو بادشاہ لوگ ہیں۔ ایک کپڑے اتار کر دوسرے پہن لیں گے مگر ہم غریبوں کی شامت آجائے کہ چھوٹے رئیس کے کپڑے خراب کر دیے۔"

"تمہارے کپڑے خراب نہیں ہوتے؟"

"سائیں ہم تو پہلے ہی مٹی میں ملے ہوئے ہیں۔ آپ اپنی بات کریں۔"

"میں کونسا آسمان کا ٹکڑا ہوں۔"

"سائیں آپ کو اللہ نے عزت دی ہے۔ بڑے گھرانے سے ہیں۔ دعا' بد دعا کے مالک ہیں۔"

خاناں نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا جیسے واقعی آسمان کی طرف دیکھ رہی ہو۔

"میں نے آج پہلی دفعہ تم کو اچھی طرح دیکھا ہے۔" محمد خان کی زبان سے الفاظ نہیں نکلے تھے بلکہ تھری نات تھری کی گولیاں تھیں جو خاناں کے دل میں اتر گئیں تھیں۔ اس کے پیروں نے ٹھوکر کھائی۔

"مگر سائیں۔" وہ گرتے گرتے بچی۔

وہ ڈوبتی تیرتی خاناں کو برآمدے میں چھوڑ کر آنگن میں آن کھڑا ہوا اور پیچھے خاناں فرش پر جھاڑو لگانے لگی۔ محمد خان کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس کے دل سے فرش سے سات پشتوں سے پھینکا ہوا کچرا سمیٹ رہی ہو۔

جس طرح دن بدلتے دیر نہیں لگتی ایسے ہی دل بدلتے بھی دیر نہیں لگتی۔ آنکھ آنکھ کا کمال ہے۔ انسان انسان سے کتنا ہی بچنے کی کوشش کرے' کتنا ہی راستہ بدلنے کی کوشش کرے اگر آدمی اندر سے لڑکھڑا جائے تو وہ ہر صورت گرے گا۔ اس سے اگر جسم محفوظ بھی رہے مگر روح کے زخم سے بچنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ زخم رگ رگ میں درد بن کر ابھرنے لگتا ہے۔ دوسری طرف خاناں حیران تھی وہ ایک معمولی خدمت گار تھی۔ اس کے باپ دادا اس کے بھی باپ دادا محمد خان کے خاندان کے قلعے کی چوکھٹ پر

حاضریاں دیتے دیتے مرکھپ گئے تھے۔ ہر سرزنش پر گردن جھکا کر کھڑے رہنا ان کا مقدر تھا۔

مگر محمد خان نے آج نہ تو سرزنش کی تھی' نہ ڈانٹ پلائی اور نہ ہی رعب جمایا۔ صرف نظروں کی تحلف خاناں کی جھولی میں ڈال دی تھی۔ اب چاہے تو وہ جھولی کو ویسا ہی پھیلا رہنے دے' یا کوڑے کرکٹ کی طرح اسے بھی جھاڑ دے۔ خاناں نے جانے کیا سوچ کر جھولی پھیلی رہنے دی۔

دونوں کی مسکراہٹیں آپس میں گڈ مڈ ہو گئیں جن سے پھر جوق در جوق پھول کھلتے گئے۔ باتوں سے باتیں چھوتی گئیں۔ جیسے انگارے ہوں اور کچھ نہیں تھا۔ یہ صرف آنکھوں کی چمک تھی۔

اس رات کتنے ہی فیصلے دل کے آنگن میں سنبھال کر سویا تھا۔ اس وجہ سے علی الصباح آنکھ کھل گئی۔ شمال کی چیختی ہوئی ہوا کی سرسراہٹوں سے رات کے ٹپکتے ہوئے دوپٹے کے دونوں سروں پر آگ سی پھیلتی جا رہی تھی۔ رات کا رنگ اڑتا جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ ڈستی ہوئی روشنی کے گہرے سمندر سے کئی آوازیں ابھریں۔

اس نے انگڑائی لے کر سینے پر ہاتھ باندھ دیے۔ جیسے گزری رات کوئی تپتا ہوا سورج اس کے سینے میں آسمان سے اتر آیا ہو اور پیچھے صرف ہلکی روشنی کی پرچھائیں چھوڑ گیا ہو اور وہ پرچھائیں اس کو اپنی روح میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے گردن اٹھا کر بند دروازے کو دیکھا۔ جس کی جھریوں سے اندر بکھری روشنی کی کرنیں امید کی طرح آہستہ سے سرد فرش پر پھیل گئیں تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور کھنکھار کر لحاف اچھی طرح سے اپنے گرد لپیٹ لیا اور کان لحاف سے باہر نکال کر ان آواز کو سننے کی کوشش کی' جو دو تین دن سے صبح کو ابھرنے والی آوازوں سے ٹوٹ کر اس کے وجود میں سردی کی طرح اتر جاتی تھی۔ جس سے وقتی طور پر اس کے اندر کی گہرائیوں میں کپکپی سی محسوس ہونے لگتی تھی۔

دروازہ چرچراہٹ سے کھلا اور خاناں کا وجود صبح کی طرح اندر داخل ہوا۔

"اب تو بستر چھوڑ دیں۔" خاناں نے جھاڑو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟"

"جھاڑو دوں گی۔"

"بھلا ہمیشہ جھاڑو دیتی رہو گی کیا؟"

"بس جس آدمی کا جو دھندہ ہو اسے وہی کرنا ہوتا ہے۔"

"کبھی دو منٹ بیٹھ کر ہم سے باتیں بھی کر لیا کرو۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

وہ فرش پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

مگر تم فرش پر کیوں بیٹھ رہی ہو؟" محمد خان کے چہرے پر پریشانی کی لکیریں ابھر آئیں۔

"پھر کہاں بیٹھوں۔"

"سامنے کرسیاں رکھی ہیں۔"

"نوکر آدمی کرسی پر نہیں بیٹھتے۔ کہاں آپ کہاں میں؟ خوامخواہ آسمان پر ٹکر ماروں کیا فائدہ۔ آپ کے پلنگ، کرسیوں پر تو پرندہ بھی نہیں بیٹھ سکتا پھر میں کیسے بیٹھ سکتی ہوں۔"

وہ ایک لمحے کے لیے رکی۔

"میری شامت تو نہیں آئی' جو کرسی پر بیٹھ کر بددعا لوں۔ اللہ پناہ دے۔ میں نے دونوں جہاں تو نہیں تڑوانے۔"

خالاں کے منہ سے نکلے الفاظ محمد خان کے دل میں گڑ گئے اور وہ اسے چپ ہو گیا' جیسے وہ اپنے ہی لئے کی کوئی دیوار ہو۔

ع۔ ق۔ شیخ

مکوست

دسمبر کی آخری تاریخیں تھیں اور سردی بھی کڑاکے کی پڑ رہی تھی آسمان پر صبح ہی سے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا میں بہت خنکی تھی' دوپہر ڈھلنے کے بعد تو سردی اور بھی زیادہ ہو گئی۔ شام کو علی اکبر نے گھر کے باہر سے آواز دی' میں باہر نکلا تو کہنے لگا۔ "تیار ہو کر آئیں تو ہوٹل جا کر چائے پیتے ہیں گپ شپ بھی رہے گی۔" میں تیار ہو کر باہر نکلا اور ہم دونوں نے ہوٹل کا رخ کیا۔

راستے میں لوگ تو اتنے نہیں تھے۔ البتہ چند ایک تانگے چل رہے تھے۔ ابھی آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ قریب سے ایک آدمی دیوانوں کی طرح چیخیں مارتا' دوڑتا ہوا گزرا۔ اس کی شلوار پھٹ کر لیرولیر ہو رہی تھی۔ وہ ابھی نظر سے اوجھل نہیں ہوا تھا کہ علی اکبر نے کہا "وہ مکوست ہے' جو ہر روز شام کو اسی راستے پر دوڑتا رہتا ہے۔"

مستوں (مجذوبوں) کا کیا ہے ان کی تو دنیا ہی اپنی ہے۔ نہ آج کی فکر نہ کل کی خبر وہ تو خود اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

ہمارے قریب سے دو تین تانگے ٹک ٹک کرتے ہوئے گزرے اور وہ مکوست (مجذوب) چیخیں مارتا دوڑتا ہوا واپس آرہا تھا۔ وہ ہمارے بالکل قریب سے دوڑتا ہوا گزر گیا۔ اس کی ٹانگیں گھٹنوں تک ننگی تھیں۔ داڑھی اور سر کے بال الجھے اور بکھرے ہوئے تھے' اس کی آنکھیں انگاروں کی مانند دہک رہیں تھیں۔ اس کی بے معنی چیخوں کے کئی حروف "بلی بچے لے آئی" "بلی بچے لے آئی" کچھ قہقہے میں نے سنے۔ وہ اس طرح دوڑتا ہوا جارہا تھا جیسے کوئی بھوکا شیر اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اس کے پاؤں ننگے تھے۔ میں نے گردن موڑ کر اسے دیکھا وہ پھر واپس آرہا تھا' ہم آگے بڑھ گئے۔

"کیا تم اسے جانتے ہو۔"

میں نے اپنے دوست سے سوال کیا۔

"نہیں مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہے' البتہ شام کو ہمیشہ یہاں دوڑتا ہوا نظر آتا ہے اور لوگ اس کو مکوست (مجذوب) کہتے ہیں۔"

اتنے میں ہم ہوٹل کے قریب پہنچے اور کونے والی پان کی دوکان سے سگریٹ لینے کے لئے ٹھہر گئے۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ مکوست بھی وہاں آکر ہم سے تھوڑی دور کھڑا ہو گیا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ اس نے بہت زیادہ پرانا اور پھٹا ہوا کوٹ پہن رکھا تھا۔ ایک میلی قمیض جس کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے اور کھلے گریبان سے گھنے

بالوں سے بھرا سینہ نظر آرہا تھا۔ شاید وہ تھک گیا تھا۔ پان بیڑی والے نے ہم کو سگریٹ دیئے اور اس کو آواز دے کر کہا۔

"نکو یہ لو سگریٹ لو۔"

اور اس نے جب زور سے گردن ہلا کر انکار کیا تو اس کے سر کے بالوں نے اس کا چہرہ ڈھانپ دیا۔ بیڑی والے نے ایک پان اٹھا کر نکو کی طرف اشارہ کرکے کہا "تو پھر پان کھاؤ" اس دفعہ نکو مست اس کے قریب آتے ہوئے دونوں بازو اوپر اٹھا کر غیض و غضب سے دھاڑا۔

"نہیں چاہیے' نہیں چاہیے۔"

اس نے ہاتھ پھیر کر اپنے چہرے سے بال ہٹائے اس کا سارا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ وہ یک ٹک پان والے کو گھورنے لگا یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں سے آگ کے شعلے نکل رہے ہوں۔ وہ تھوڑا سا پان والے کی طرف بڑھا اور میں نے سمجھا کہ بس اب خیر نہیں ہے۔ پان والے نے دونوں ہاتھ باندھ کر کہا۔ "نکو بابا معاف کردو۔" یہ الفاظ سن کر نکو مست نے بھیانک آواز سے زور دار قہقہہ لگایا۔ پتہ نہیں اس کے جسم سے یا منہ سے بدبو کا بھبکا سا آیا اور وہ زمین پر زور زور سے پاؤں پٹختا ہوا اور خوف ناک لہجے میں "بلی بچے اٹھا لائی' بلی بچے اٹھا لائی" کہتا ہوا سڑک پر دوڑتا چلا گیا۔

علی اکبر نے پان والے سے پوچھا۔

"بھائی تم اس مست کو جانتے ہو؟"

"ہاں سائیں یہاں کا ہر شخص اس کو جانتا ہے۔ مجھے یہاں دکان کھولے پورے پانچ سال ہو گئے ہیں اور یہ ہر روز اسی راستے پر اور اسی وقت گھنٹے ڈیڑھ تک اسی طرح دوڑتا اور چیختا رہتا ہے۔ بس سائیں مست ہے اور پاگل بھی لیکن نقصان کسی کو نہیں پہنچاتا ویسے اگر کوئی چیز اسے دی جائے تو لے لیتا ہے' لیکن اس وقت وہ کسی سے کچھ نہیں لیتا آج تو میں اس کو آزما رہا تھا۔ خدا بھی پتہ نہیں کن چیزوں سے راضی ہے۔ یہ تو درویش ہے' درویش۔"

"یہ رہتا کہاں ہے؟ اور پاگل کس طرح ہو گیا؟"

پان والے سے میں نے اکٹھے دو سوال کر دیئے۔

پان والا ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

"سائیں یہ تو مجھے بھی پتہ نہیں کہ وہ کیسے پاگل ہوا۔ خدا کسی انسان کا ذہن نہ بھٹکائے یہ سامنے بلڈنگ دیکھ رہے ہو نا یہ اسی میں رہتا ہے۔"

اتنے میں نکو مست پھر واپس آرہا تھا۔ اب ہم ہوٹل کے ایک کونے میں جاکر بیٹھ چکے تھے۔ بیرا آیا تو اسے چائے لانے کے لئے کہا ہوٹل کا ماحول پرسکون اور خوشگوار تھا۔ میں سوچنے لگا پتہ نہیں نکو مست کون ہے؟ اس کے بھی کوئی رشتہ دار وغیرہ تو ہوں گے؟ وہ پاگل کیوں ہوا؟ کیا اس کا علاج نہیں ہو سکتا؟ یہ بھی ایک انسان ہے اور یہ بھی کوئی زندگی ہے......... اتنے میں بیرے نے چائے میز پر رکھی میرے دوست نے ایک چچ چینی بھر

کر چینک میں ڈالی اور چینک ڈھک دی۔ ہم سے تھوڑی دور ایک ادھیڑ عمر کا شخص بیٹھا تھا اس کے آگے بھی چائے کی پیالی رکھی تھی اور وہ بار بار علی اکبر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ موصوف بار بار تمہیں دیکھ رہے ہیں۔" میں نے آہستگی سے اپنے دوست علی اکبر کو بتایا۔ علی اکبر اسے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔

"چاچا حامد علی یہاں آئیں نا۔"

وہ اپنا کپ اٹھائے ہمارے پاس آکر بیٹھ گئے۔ علی اکبر نے تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ ہیں چاچا حامد علی اسی محلے اور اسی جگہ کے رہنے والے ہیں۔ یہ ایک زمانے میں ہمارے آفس میں کلرک تھے اور اب تو ریٹائر ہو گئے ہیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے ان سے ہاتھ ملایا۔ چاچا حامد علی نے اکبر سے آفس کا حال احوال پوچھنا شروع کیا۔ میں نے ساتھ والی کھڑکی سے باہر دیکھا تو کومست ابھی تک چیختا ہوا دوڑ رہا تھا' اتنے میں چاچا حامد علی نے باہر دیکھتے ہوئے کہا "سردی کی لہر کوئٹہ سے آئی ہے۔ آپ کس گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں مکمل خاموشی اختیار کرلی۔"

میں نے جواب دیا "آپ لوگ باتیں کر رہے تھے اس لئے گستاخی نہیں کی۔"

میرا جواب سن کر چاچا حامد علی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اسی وقت باہر سے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔

کومست راستے پر دوڑتا جارہا تھا۔ علی اکبر نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"بے چارہ کومست۔"

میں نے جواب دیا "کاش خدا انسان کو بے چارہ نہ بنائے۔"

"ہاں خدا کسی دشمن کو بھی بے چارہ نہ بنائے۔ اس مست پر جو کچھ بیت چکی ہے وہ اگر کسی اور صحیح الدماغ آدمی پر گزرتی تو اس کا حال اس سے بھی بدتر ہوتا۔" وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

"چاچا۔۔۔ کیا آپ اسے جانتے ہیں؟" علی اکبر بولا۔

"آپ تو اسی محلے میں رہتے ہیں یہ کیسے پاگل ہوا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

چاچا حامد علی سگریٹ سلگا کر ایک گہرا سانس لے کر کہنے لگے۔

"میں اس مست کو جانتا ہوں۔ اس کا نام کومست نہیں بلکہ مقبول مستری ہے۔ ویسے بھی ہر انسان کی زندگی میں اتار چڑھاؤ آتا ہے لیکن مقبول نے صرف دکھ دیکھے ہیں۔ وہ چار سال کا تھا کہ اس کی ماں مر گئی۔ دس سال کا ہوا تو باپ بھی مر گیا۔ اس کے باپ کی یہاں پر لوہے کی دوکان تھی اور وہ اچھا خاصا سیٹھ آدمی تھا لیکن اس کے مرنے کے بعد مقبول کے ماموں اور چچا پرائے مال پر گدھ بن کر ٹوٹ پڑے۔ بے چارہ مقبول رشتے داروں کے ہوتے ہوئے بھی لاوارث ہو گیا۔ اسے کسی نے بھی سہارا نہیں دیا۔ آخر کار محلے کے دین محمد مستری کو خیال آیا اور وہ اسے اپنے گھر لے آیا اور اپنے کارخانے میں ملازم رکھ لیا۔"

"پھر کیا ہوا؟" علی اکبر نے پوچھا۔

چاچا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ مقبول نے کچھ رقم کہیں دفن کی تھی جس کوئی کوئی نکال کر لے گیا' اس وجہ سے یہ پاگل ہو گیا' کوئی کہتا ہے کہ کچھ قلعے سے جن کا اثر ہو گیا ہے اور کسی کا کہنا ہے کہ اس کو کسی پہنچے ہوئے بزرگ نے امانت دی ہے' لیکن مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ نا تو اس نے راستے میں کہیں دولت دفن کی تھی نہ اس پر کسی جن کا اثر ہے اور نہ ہی کسی نے کوئی امانت اس کو دی ہے۔ کچھ پتھر دل لوگ تو یہ باتیں بھی کرتے ہیں کہ اس کے پاس کیمیا کا نسخہ ہے اور یہ جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کر کے لوگوں کی توجہ اپنے اوپر سے ہٹاتا ہے' لیکن یہ سب باتیں جھوٹی اور غلط ہیں۔"

"تو پھر اصل بات کون سی ہے۔"

چاچا حامد علی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا دین محمد مستری بہت بڑا کاریگر تھا۔ اس نے مقبول کو ہر قسم کی مشین کی مرمت کا کام سکھایا تھا۔ مقبول بہت سعادت مند ثابت ہوا اور دین محمد مستری نے اپنی لڑکی کی اس سے شادی کرا دی' پھر تو اس جوان نے اپنے ہنر میں بہت نام پیدا کیا۔ ہمارے گھر کے سامنے والی بلڈنگ میں مکان کرائے پر لے کر الگ رہنے لگا۔"

ہم تینوں نے سگریٹ سلگائے اور دوبارہ چائے کا آرڈر دیا۔

چاچا حامد علی پھر شروع ہو گئے۔ "مقبول کی شادی کو دو تین سال گزر گئے تھے لیکن اسے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اس کی بیوی نے سفید رنگ کی بلی پالی ہوئی تھی۔ بلی بڑی ہوئی تو اس نے بچے دیئے اور اسی زمانے میں ہی مقبول کے یہاں بھی ایک خوبصورت بیٹا پیدا ہوا۔ کافی دنوں کے بعد ایک شام کو اس بلڈنگ میں آگ لگ گئی۔ بجلی کی تاریں پرانی اور خراب تھیں۔ مالک خرچ بچانے کی خاطر اسے ایسے ہی چلا رہا تھا' لیکن اس دن انہیں تاروں میں آگ لگ گئی اور پتہ تب چلا جب آگ پوری بلڈنگ میں پھیل گئی۔ فائر بریگیڈ کی ساری گاڑیاں آگ بجھانے کے لئے آئیں لیکن انہوں نے بھی پہلے مالک مکان کے گھر کی طرف سے آگ بجھانا شروع کی۔"

اتنے میں بیرا چائے لے آیا اور ہم نے چائے کپ میں انڈیل کر گرم گرم چائے پینی شروع کی چائے پیتے ہوئے علی اکبر نے پوچھا۔

"ہاں چاچا آگ لگی پھر؟"

چاچا بتانے لگے۔

"وہ آگ' آگ تو نہیں تھی۔ اس کے شعلے آسمان تک جا رہے تھے۔ ہزاروں کا سامان جل کر راکھ ہو گیا اس رات جیسے دوزخ زمین پر اتر آئی تھی۔ صرف مالک کا مکان بچ گیا تھا چاروں طرف وائے ویلا مچی ہوئی تھی۔ ہر کسی کو اپنی پڑی ہوئی تھی' بلڈنگ کا ہر باسی حیران و پریشان تھا۔ مقبول مستری نے اپنی بیوی اور بچے کو بچانے کی بہت کوشش کی اس کی بیوی اور بچے کو جب باہر نکالا گیا تو وہ اس کے سامنے ہی تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ عین اسی وقت ان لاشوں کے قریب سے وہی پالتو بلی پتہ نہیں کیسے اور کہاں سے اپنے بلونگڑوں سمیت خود کو بچا کر میاؤں میاؤں کرتی آ کر مقبول کے پیروں میں گری۔ مقبول مستری نے بلی کو دیکھ کر دل دہلانے والی چیخیں ماریں اور ادھر

دوڑتے ہوئے کہنے لگا۔ "ملی بچے اٹھا لائی" اور پھر پاگلوں کی طرح وہیں چکر لگاتے ہوئے گر پڑا۔ اس حادثے کو آج پندرہ سال گزر چکے ہیں' اس دن سے مقبول مستری ہر روز جٹ لگنے والے وقت اسی راستے پر سردی ہو یا گرمی تڑپتا' چیختا اور دوڑتا رہتا ہے۔"

علی احمد بروہی

چاچا جیونے کا فوٹو لگانا

چاچا جیونا ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر ایسی قسم کے لوگوں میں سے ہے جو طبیعتاً" محنتی ہوتے ہیں اور ان کے اعضا کام کرنے کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ ان کو بیکار بیٹھنا نہیں آتا۔ کچھ لوگ سست اور کام چور بھی ہوتے ہیں' کوئی کام درپیش ہو تو ٹالتے رہتے ہیں اور بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ بہت سے درویش ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جاہل عورتوں کی طرح بین کرکے روتے ہیں۔ چاچا جیونا تمام عمر کبھی نہیں رویا۔ ابھی حال ہی میں جب اس کی پھوپھی کا انتقال ہو گیا تب بھی مجال ہے کہ ایک آنسو بھی ٹپکا ہو۔ اگر کبھی ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے بھی گئے تو سمجھا جاتا ہے کہ ابھی کچی پیاز کھائی ہوگی یا پھر قیصر ہوٹل کی "سنگل سالن" والی مرچوں نے دل پر بوجھ ڈالا ہے۔

ان کے کام کرنے کا طریقہ بھی عجیب و غریب اور نرالے ڈھنگ کا ہے۔ جب بھی اس گھر سے شور و غل اور افراتفری کی آوازیں آئیں تو محلے والوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ چاچا جیونا کوئی نہ کوئی کام کر رہا ہے چیخم پکار اور بدحواسی کا ایسا مظاہرہ کرتا ہے جیسے آبکاری پولیس نے کسی اڈے پر چھاپہ مارا ہو۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چاچا جیونے کو فلم کی ایکٹریس کی تصویروں کا عشق جاگا۔ بازار سے بڑے غور و فکر کے بعد نن نن بیگم کی سنہری تصویر خرید کر گھر لائے۔ فلم ایکٹریس نن نن بیگم کی تصویر کے انتخاب کے لئے فلسفیانہ رائے یہ دی کہ ہر فلم دیکھنے والے کے گھر میں اس کی تصویر لازمی طور پر ہونی چاہیے۔

جب گھر کے افراد کا آپس کا جھگڑا یا تکرار ہو اور گھر کے افراد کو ایک دوسرے کے چہرے بھی برے لگ رہے ہوں تو نن نن بیگم کا فوٹو دیوار سے اتار کر سامنے لایا جائے تو غصہ کافور ہو جائے گا اور سب آپس میں شیر و شکر ہو جائیں گے۔

چاچا جیونا تصویر خرید کر گھر آئے اور تخت پر چڑھ کر اعلان کیا کہ وہ تصویر خود اپنے ہاتھوں سے لگائیں گے اور ساری محنت خود کریں گے۔ اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے چاچا نے پہلے کوٹ' ٹوپی' جوتا اور تقریباً سب کچھ اتار کر رکھا اور پیر و مرشد کو یاد کرتے ہوئے تصویر لگانے کے لئے تیار ہو گئے۔ گھر کے سارے بچوں کو جمع کرکے پہلے تو وعظ کیا کہ بہشت باپ کے قدموں تلے ہوتی ہے اور باپ کا حکم ماننا یعنی جنت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بڑے بیٹے نے اعتراض کیا کہ بہشت تو ماں کے قدموں تلے ہوتی ہے۔ چاچا جیونے نے سختی سے جھڑک کر کہا کہ "اندھے ہو گیا۔ تمہاری ماں کے قدموں تلے تو سینڈل ہیں اور وہ سارا دن باورچی خانے میں بیٹھی رہتی ہے' پھر تو کہنا چاہیے بہشت اور ہمارے باورچی خانے میں کوئی فرق نہیں ہے۔"

تقریر پوری کرکے اپنے بڑے بیٹے کو ایک آنہ دے کر' دو پیسے کی کیلیں بازار سے لانے کے لئے بھیجا۔ دوسرے بیٹے کو اس کے پیچھے بھیجا کہ کیلیں ایک انچ کی ہوں مبادا کہیں وہ آدھ انچ کی لے آئے۔ پھر بسم اللہ کرکے چاچا نے گھر کو سر پر اٹھانا شروع کیا۔

" نبن بیٹا تم کاکا قاسم کے گھر سے ہتھوڑا لے آؤ........ اور شیرو بیٹا تم لنگڑے ماسٹر کے گھر سے فتا لے آؤ جلدی کرو اور ربو تم بھاگ کر ماسی جمعے کی اماں کے یہاں سے دھاگہ لے آؤ اور بمن سے کہتے جاؤ کہ اندر سے تپائی اور کرسی باہر نکال کر رکھے۔"

"بڑی لڑکی کہاں غرق ہو گئی؟ او شرفل! شرفی اور چھوکری! نکری کہاں مر گئیں!"

" ربن بیٹا تم حاجی سومرو نانبائی کے گھر جاؤ اور اسے میرا سلام بولو اور کہو بابا پوچھ رہے ہیں کہ آپ کی ٹانگ کیسی ہے؟ (حاجی سومرو کو ابھی حال ہی میں کتے نے کاٹا تھا) اور یہ بھی کہنا کہ آپ کی سیڑھی کچھ دیر کے لئے ہمیں چاہیے........ اور راستے میں بیٹھک سے موسے اور قابل دونوں کو بلا لاؤ تاکہ مجھے مضبوطی سے پکڑ کر کھڑے ہوں مبادا کہیں سیڑھی سے پاؤں نہ پھسل جائے۔

جمعا........ او جمعا........ ارے جمعا کہاں گیا؟ یہ لڑکا تو سارا دن کام سے جان چراتا رہتا ہے۔ حرامخور کو صرف دو موٹی سی روٹیاں حلق سے اتارنی ہوتی ہیں........ جمعا..... ارے بابا میرا تو حلق بیٹھ گیا........ تم یہاں کھڑے ہو جاؤ اور مجھے تصویر اٹھا کر دینا۔"

جب تک آپریشن کے سب اوزار جمع ہوں تب تک چاچا نے تصویر کو ایک نظر معائنہ کرنے کے لئے جیسے ہی جھپٹا مار کر اٹھانا چاہا تو تصویر جو میز پر بے ترتیبی سے پڑی تھی' نیچے گر پڑی اور ٹن ٹن بیگم صاحبہ فریم سے نیچے گر پڑی۔ چاچا نے شیشہ بچانے کی بہت کوشش کی لیکن شیشہ تو نہیں بچ سکا البتہ مزید کرچی کرچی ہو گیا اور چاچا کی انگلی بھی زخمی ہو گئی۔ انگلی سے خون ٹپکتا دیکھ کا چاچا نے ناچنا شروع کر دیا پھر رومال کے لئے چکر لگانے لگے۔ ان کا رومال کوٹ کی جیب میں رکھا تھا وہ بھول گئے کہ انہوں نے کوٹ کہاں رکھا تھا' پھر تو گھر کے سب افراد اوزار اور سیڑھیاں چھوڑ کر کوٹ کی تلاش میں سرگرداں پھرتے رہے۔ چاچا جیونا سب کو جھڑکیاں دیتے اور ان کی تلاش میں رکاوٹیں پیدا کرتے رہے۔

"خدا کے نام پر کسی بندے کو معلوم ہے یا نہیں کہ میرا کوٹ کہاں ہے؟...... خدا کی قسم اس گھر کے افراد جیسا ست اور بے کار خاندان کہیں بھی نہیں ہوگا۔ ابھی دو منٹ ہوئے تھے کہ کوٹ اتار کر رکھا تھا اور کوٹ غائب' کیا دیواریں کھا گئیں؟ یا کہیں غیب سے کوئی آکر کوٹ ہضم کر گیا؟ ارے تم گیارہ کے گیارہ افراد بھی کوٹ تلاش نہیں کر سکتے؟"

اور پھر خود ہی کوٹ تلاش کرنے کے لئے اٹھے۔ اٹھتے ہوئے دیکھا کہ کوٹ ان کے نیچے پڑا ہوا تھا پھر چلاتے ہوئے بولے "چھوڑو اب مل چکا تم لوگوں کو کوٹ' یہ دیکھو میں نے خود تلاش کیا ہے۔ تم لوگوں کو کوٹ ڈھونڈنے کا کہنا ایسے ہے جیسے بھبول سے بیر مانگنا ہو۔"

تقریباً آدھا گھنٹہ چاچا کی شہید انگلی پر مرہم پٹی میں صرف ہوا۔ نیا شیشہ آیا اور تصویر کا فریم تیار ہوا۔ سارے مانگے ہوئے سامان مثلاً سیڑھیاں' کرسیاں اور تپائیاں' ہتھوڑے اور کیلیں وغیرہ حاضر کئے گئے تو چاچا جیونا

نے ایورسٹ پر دوسری دفعہ چڑھائی شروع کی۔ گھر کے گیارہ افراد دو نوکر ایک نوکرانی مائی بگل سارے کے سارے چاروں طرف باجماعت' باادب باملاحظہ ہوشیار کھڑے ہو گئے۔ دو لوگوں نے کرسی کو پکڑا اور دو نے سیڑھی کو جو کہ کرسی کے اوپر رکھی تھی اور دو تین نے چاچا جیونے کو اوپر چڑھنے کے لئے سہارا دیا۔ ایک لڑکا ان کو کیلیں دینے کے لئے تیار کھڑا ہوا اور دوسرا تصویر پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ہتھوڑے والے لڑکے نے میز پر چڑھ کر جیسے ہی چاچا کو ہتھوڑا پکڑایا تو چاچا کے ہاتھ سے کیلیں نیچے گر پڑی۔

"دیکھو پھر کیل نیچے گرا دی۔ کم بخت رہن تو تم صفا چٹ ہو۔ پتہ نہیں کم بخت بڑے ہو کر کیا کرو گے۔"

پھر کیل کی تلاش شروع ہوئی سارے افراد کوئی چارپائی کے نیچے کوئی کرسیوں کے نیچے اوندھے ہو کر کیل کے لئے ہاتھ مارتے رہے اور چاچا جیونا سیڑھی پر چڑھے واہی تباہی بکتے رہے کہ "آخر ان کو اس طرح لٹکا کب تک رکھا جائے گا۔ کیا وہ حضرت عیسیٰ ہیں جن کو صلیب پر ٹانگ کر نیچے سے سیڑھی ہٹا لی جائے گی؟"

جب کیل ملی تو ہتھوڑا گم ہو گیا۔

"رب کی پناہ آخر تم لوگ میری طرف کیا دیکھ رہے ہو کیا میں پاگل ہوں؟ یا پھر میرا خوبصورت چہرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا؟"

آخر ہتھوڑا ڈھونڈ کر چاچا کے حوالے کیا گیا تو کیل لگانے کے لئے جو نشان لگایا گیا تھا وہ گم ہو گیا۔ اب کیل کہاں لگائی جائے؟

گھر کے سب افراد نے اوپر چڑھ کر وہ نشان تلاش کیا اور اس میں سے ہر ایک نے الگ الگ جگہ پر نشان بتایا۔ چاچا نے ان میں سے ہر ایک کو "گدھا" "لنگور" "بے وقوف" اور "اندھے" ہونے کے سرٹیفکیٹ عطا کرتے اور ٹانگ سے کھینچ کر اتارتے رہے پھر فتا اٹھا کر نئے سرے سے ناپ لینا شروع کی۔ نئے نشان کے لئے نئے سرے سے حساب کتاب کی ابتدا کی۔ دماغ سوزی بھی ایسی کہ ان کو خود پتہ نہیں چل رہا تھا کہ دیوار کی لمبائی ۳۳ فٹ...... تیس کا آدھا؟ ۱۵ فٹ...... دو کا آدھا (ایک) اور ایک کا آدھا پوچھتے ہوئے وہ پھر تیس کا آدھا بھول جاتے۔ زبانی حساب کرتے ہوئے چاچا پاگل ہو گئے۔ بھلا چاچا جنہوں نے کبھی پانچ روپوؤں کی پوری ریزگاری بھی نہیں گنی تھی وہ کیسے زبانی حساب کرتے۔ کف بانچوں سے بہہ رہا تھا اور چڑ چڑے ہو رہے تھے۔ آخر چوک اڑتالیس' اڑتالیس کا آدھا سینتیس آخر سب نے حساب کرنا شروع کیا۔ خدا کے فضل سے ہر ایک کا جواب الگ الگ ہی آیا۔ بڑی بہن کا جواب تو اربوں اور کھربوں میں آ رہا تھا۔ ایک دوسرے کو غلط کہتے ہوئے پھر جھگڑا شروع ہوا' خانہ جنگی کے عالم میں سب اصلی ناپ بھول گئے۔ چاچا جیونے نے دیوار کو ناپنے کے لئے نئے سرے سے سروے شروع کیا۔

اس دفعہ چاچا نے ناپ لیتے وقت فتے کی بجائے دھاگے کو استعمال کیا اور دھاگے کو کھینچتے وقت جیسے ہی ۳۵ ڈگری پر دوڑتے ہوئے پہنچنے کی کوشش کی تو چاچا کا پاؤں کرسی سے پھسل گیا اور وہ نیچے رکھے ہوئے ہارمونیم پر جا گرے۔ ہارمونیم نے اچانک افتاد پر راگ الاپا جیسے کسی فلم میں موت کا میوزک بج رہا ہو۔

چاچا جیونے کی گوہر فشانی کے متعلق چاچی جنت کھلے عام یہ کہتی سنی گئیں کہ وہ بچوں کو ایسی گالیاں دینے کی ہرگز اجازت نہیں دیں گی۔ ایک دوسرے کو غلط کہتے ہوئے پھر جھگڑا شروع ہوا چاچا سنی ان سنی کرتے ہوئے

اٹھ کھڑے ہوئے اور تھوڑا سا پانی پی کر تازہ دم ہوئے اور دوبارہ سیڑھی پر براجمان ہوئے۔ نشان لگا کر اس پر کیل رکھی جیسے ہی دوسرے ہاتھ سے اس پر ہتھوڑا مارا تو ہتھوڑا سیدھا جا کر چاچا کے انگوٹھے پر لگا۔ ہتھوڑا اور کیل دونوں نیچے جا گرے اور انگوٹھا چوٹ لگنے کی وجہ سے کالا نیلا ہوتا رہا۔ چاچا نیونے نے ایک فلک شگاف چیخ ماری۔

"باپ رے! باپ رے!" اس طرح کہنا شروع کیا جیسے پشتو میں خنک خان توی گیت گا رہا ہو۔ گھر کا کوئی فرد کہاں چھپا کوئی کہاں جا کر چھپا۔ چاچا نیونے کے منہ سے گالیوں کی بوچھاڑیں نکل رہی تھیں۔ چاچی جنت نے بلند آواز میں اپنی شخصی رائے ظاہر کی کہ "دوسری دفعہ اگر رین کے ابا نے تصویر ٹانگنے کا ارادہ کیا تو ہفتہ پہلے بچوں کو لے کر میکے چلی جائے گی' جب تک کیل صحیح طرح دیوار میں نہ لگا لیں واپس نہیں آؤں گی۔"

"اے عورتو!" چاچا نیونا چیختے ہوئے بولے۔

"اے عورتو! تم کو تو صرف وائے ویلا اور طوطے کی طرح ٹیوں ٹیوں کرنا آتا ہے....... ایک تو خود کوئی کام نہیں کرتی ہو پھر اگر دوسرا کوئی کام کرتا ہے تو اس کے کام میں روڑے اٹکاتی ہو اور عورتوں والے نخرے کرتی ہو۔ اگر میرا دل کام کرنے کو چاہتا ہے تو کون ہے جو مجھے روکے؟"

اس کے بعد چاچا نے دوبارہ کیل لگانا شروع کی۔ کیل کے اوپر اتنی زور سے ہتھوڑا مارا کہ دو دفعہ ہتھوڑا ٹھوکنے کے بعد کیل تو غائب ہو گئی۔ البتہ ہتھوڑا بھی تقریباً آدھا دیوار میں گھس گیا' پھر دوبارہ نیا نشان نئی کیل اور نئے سرے سے چڑھائی۔

چاچا دسمبر کی ٹھنڈک کے باوجود پسینے پسینے ہو رہے تھے انہوں نے پھونکیں مارتے بازو سکیڑ کر دوبارہ کام شروع کیا۔ ٹھا ٹھا تو دھاگہ غائب' دھاگہ ملا تو ہتھوڑا غائب' کچھ بچے کرسیوں پر کھڑے تھے وہیں سو گئے' اور کچھ کھسک کر اپنے بستروں میں جا کر دبک گئے۔ چاچا نیونا اکیلے اپنے کام میں لگے رہے پھر صبح کاذب ہونے پر جب مرغ نے صبح کا پیغام دینا شروع کیا تو چاچا آخر کار تصویر ٹانگنے کے کام سے فارغ ہوئے دیوار کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے اس کو جگہ جگہ سے کھرچا گیا ہو۔ فرنیچر اور گھر کے دوسرے سامان کی حالت بھی ایسی ہو رہی تھی جیسے بھونچال آیا ہو بلکہ اس سے بھی بدتر تھی۔ چاچا کام ختم کرنے کے بعد اف کر کے کرسی پر ڈھیر ہو گئے اور پھر جا کر چاچی جنت کو نیند سے اٹھایا اور بولے کہ "اب دیکھو تصویر خوبصورتی سے لگائی ہے یا نہیں؟"

غلام ربانی آگرو

پیار کی پری

شہر سے کچھ دور سمندر کے کنارے ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی، جس کی چوٹی پر بحری فوج کے اعلیٰ افسروں کے لئے ایک چھوٹی سی کینٹین بنی ہوئی تھی۔ بوڑھا خانساماں جو اس کینٹین کا چوکیدار بھی تھا، اس نے مجھے بتایا کہ کبھی کبھی کوئی افسر کسی لڑکی کو لے کر یہاں آتا ہے اور رات عیش میں گزار کے صبح کو واپس چلا جاتا ہے۔ ورنہ مہینے گزر جاتے ہیں اور کوئی پرندہ بھی پر نہیں مارتا ہے۔ اس نے پتے کی بینسری سلگا کر سامنے بیٹھے ہوئے بوڑھے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "البتہ یہ بڑے میاں، مہینے دو مہینے میں ضرور چکر لگاتے ہیں یا بعض دفعہ آپ کی طرح کوئی سیر سپاٹے کا شوقین یہاں آنکلتا ہے اور چائے کا کپ پی کر چلا جاتا ہے۔"

"یہ بوڑھا کون ہے؟" میں نے چائے کپ میں انڈیلتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

"کسی کالج کا ریٹائرڈ پروفیسر ہے۔" خانساماں نے ذرا زور سے کہا۔

"اس کی باتیں بہت مزے دار ہوتی ہیں۔"

"ہاں میری باتیں واقعی مزے دار ہیں۔ خاص کر کے آپ کی عمر کے نوجوانوں کے لیے۔" بوڑھے نے میری طرف دیکھ کر مسکرا کر کہا۔

"تو پھر یہاں آئیں تاکہ چائے کا کپ بھی ساتھ پیئیں اور کوئی بات چیت بھی کریں۔"

"شکریہ" پروفیسر اٹھ کر میری ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں نے ابھی چائے پی ہے۔"

نیچے پہاڑی میں زور سے سمندری لہریں ٹکرائیں۔ ہم دونوں سمندر کی طرف دیکھنے لگے۔ دور دور جہاں تک نظر جا رہی تھی، وہاں نیلاہٹ ہی نیلاہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ البتہ کنارے کی موجیں پانی سے اٹھ کر پانی میں ہی گر رہی تھیں جن کا سفید سفید جھاگ، ہوا کے زور سے پانی کے اوپر سے تیرتا ہوا کناروں پر جمع ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی اور بھیگی ہوائیں شور کرتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ مشرق جنوب کی طرف کنارے سے کافی دور، ایک جہاز بتیاں جلائے کھڑا تھا، ہوا کے شور میں بھی اس کے بھونپو کی آواز سننے میں آ رہی تھی۔ پروفیسر نے جہاز کی چمنی سے نکلتے ہوئے کالے دھویں کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

"اس بات کو کئی سال گزر گئے ہیں تب میں آپ کی عمر کا ہونگا اور کالج میں پڑھتا تھا۔ ہاسٹل کے

ایک کمرے میں اکیلا رہتا تھا۔ سردیوں کی ایک رات تھی۔۔۔۔

ہاں.....وہ سردیوں کی پورے چاند کی رات تھی' میں چینی کہانیوں کی کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ کتاب بہت دلچسپ تھی' میں نے تقریباً دو بجے رات کو کتاب ختم کی اور بتی بجھا کر بستر پر لیٹ گیا لیکن ابھی آنکھ ہی لگی تھی کہ چاند کی کرنیں کھڑکی کی درزوں سے اندر تیر آئیں۔ مجھے روشنی میں نیند نہیں آتی۔۔۔۔ سن رہے ہیں نا؟"

مجھے سمندر کی طرف دیکھتا پا کر پروفیسر نے پوچھا۔

"میرے کان آپ کی طرف ہی لگے ہوئے ہیں۔"

میں نے انہیں اطمینان دلایا۔

اور انہوں نے کہنا شروع کیا۔

"ہاں میں بات کر رہا تھا...کہ .....مجھے' روشنی میں نیند نہیں آتی۔ وہ روشنی چاہے کیسی بھی ہو۔ چاند کی چاندنی' چاہے دھوپ یا بتی کی شعاع ہو' اس لیے ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ چاند کی کرنیں کھڑکی کی درزوں سے اندر تیر آئیں اور ساتھ ہوا کا ایک جھونکا آیا جس نے کھڑکی کے بند پٹ زور سے کھول دیے۔ کھڑکی کے پٹ کھلنے کی آواز سے میری خمار آلود آنکھیں کھل گئیں۔ کسی کے چلنے کی آہٹ سن کر میں چونک گیا۔ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کوئی کمرے میں گھوم رہا تھا۔ پہلے وہ کمرے کے کونے میں تھا پھر میری طرف بڑھنے لگا جب کھڑکی کے سامنے سے گزرا تو وہ چاندنی میں نہا گیا لیکن میں حیرت زدہ ہو گیا۔ وہ تو کوئی اپسرا تھی۔

اس کا گورا گورا جسم' ایسے چمک رہا تھا' جیسے' چاندی کے آئینے میں گلاب کا عکس اور اس کے بال۔۔۔۔۔ لیکن میں ان کو بال کیسے کہوں؟ وہ تو خالص سونے کی تاریں تھیں جن سے صندل کی خوشبو آرہی تھی۔ یقیناً وہ آدم زاد نہیں تھی۔ کیا آدم زاد کی اتنی خوبصورت آنکھیں ہوتی ہیں؟ اس کی چال فاختہ کی چال سے زیادہ نرم اور من موہنی تھی۔

"تم کون ہو؟"

میں نے دل تھام کر پوچھا

"میں۔۔۔۔ میں پیار کر پری ہوں۔"

اس کی آواز معصوم بچے کے قہقہوں کی طرح مدھر اور میٹھی تھی۔

"کہاں سے آئی ہو۔"

میں نے دوسرا سوال کیا۔

"آسمان کے بیچ میں وہ سفید پٹی ہے نا؟"

اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں ابھی وہیں سے آئی ہوں۔"

میں آگے بڑھ کر اس کے قریب گیا۔

"مجھے اس طرح مت دیکھو۔"

اس نے اپنی اداس آنکھوں سے مجھے دیکھ کر کہا۔

"کیوں؟" میں نے دوبارہ پوچھا۔

"کیوں؟ کیوں؟"

"ان آنکھوں میں بناوٹی پیار ہے۔"

اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں دلوں کا حال جانتی ہوں؟"

اس نے جواب دیا۔

"وہ کس طرح؟" اس کے چہرے کو گھورتے ہوئے پوچھا اور اس نے برستی ہوئی بدلی کے انداز میں گردن موڑتے ہوئے جواب دیا۔

"پیار کا گھر' انسان کا دل ہی تو ہوتا ہے۔"

"اور تم "پیار کی پری" ہی تو ہو۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم میرے ساتھ چلو گے۔" اس نے پوچھا۔

"کہاں؟"

"آسمان کی سیر کرنے۔"

"بسرو چشم۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "لیکن مجھے دھرتی زیادہ پیاری ہے۔"

"تو پھر آج دھرتی پر ہی تمہاری دیس کی سیر کریں گے۔"

اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر باہر ہوا میں کھڑے ہوئے تخت پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

اس کا تخت ہاتھی دانت کا بنا ہوا تھا۔ اس کے چاروں کونوں پر چار مور کھڑے تھے۔ جو اس کے تخت کو اڑا رہے تھے۔ موروں کی آنکھوں میں لال یاقوت تھے جن سے شبنم کے قطرے موتی کی طرح چمکتے ہوئے گر رہے تھے جب وہ پر پھیلا کر تخت لے کر اڑتے تو ان کے پروں سے ایسی آواز نکل رہی تھی' جس سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بارش میں بھیگے ہوئے کبوتر اپنی چونچ سے پر سہلا رہے ہوں۔"

پروفیسر نے تمباکو پائپ میں بھر کر سلگایا' پھر کہنے لگا۔

"ہمارا تخت پہلے خالی میدانوں اور اجڑے شہروں پر سے گزرا۔ کہیں ویران کھنڈروں پر ریت پڑی ہوئی تھی اور کہیں مٹی کے شاہی کھنڈروں میں گیدڑ بول رہے تھے۔

"کبھی یہاں زندہ لوگوں کے گھر ہوں گے۔"
پیار کی پری نے کھنڈروں کی طرف دیکھ کر کہا "اور آج گیدڑ بول رہے ہیں۔"
پھر میری طرف منہ کر کے کہنے لگی۔
"عمر خیام کی وہ رباعی یاد ہے' جس میں نوشیروان کے شہر مداین کے متعلق کہا ہے۔
"جن محلوں کی دیواریں عرش سے بھی اونچی تھی۔
ان محلوں کے کنگروں پر میں نے فاختہ کو کوکو کرتے دیکھا ہے۔"
"خیام کی وہ رباعی تو یاد نہیں ہے لیکن سائیں یاد ہے۔
تھے معشوق کے ٹھکانے یہاں رنگ اور روپ اور راگ یہاں پر
تھے برمہ والوں کے نصیب یہاں وہ سب پھیرا لگا کر ختم ہو گئے"
"یہ سائیں کون تھا؟" پیار کی پری نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔
"تھا میرے دیس کا ایک شاعر شہزادہ......"
میں نے جواب دیا۔
"اس کا انجام؟"
"جو دنیا کا انجام ہوتا ہے۔"
"فقط باتیں رہ گئیں۔"
"وہ بھی غنیمت ہے۔"
"میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔"
"کسی کی تو آج باتیں بھی باقی نہیں رہتیں ہیں۔"
"اس کا علاج؟"
پری نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔
"مٹی کی کیا مجال کہ کمہار سے پوچھے کہ کیوں مجھے بنا رہے ہو' اور کیوں توڑ رہے ہو؟"
میں نے عمر خیام کے الفاظ دھرائے۔
"کروڑوں سال پہلے ایتھنس کے اوپر سے اڑتے ہوئے میں نے ایک فیلسوف کو کہتے سنا تھا کہ
" Men will die But man will live"
"اس کا ثبوت؟"
"وہ دریا اور اس کے قریب والی ہریالی۔"
اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔
میں نے نیچے دیکھا۔ ہمارا تخت اب دریا کے اوپر اڑ رہا ہے جہاں مچھلی پکڑنے والی اور دوسری کشتیوں میں ملاح عورتیں گیت گا رہی تھیں اور مرد بیٹھے ہوئے بادبان سی رہے تھے۔ دریا کے بعد ہم

"کہاگاہ" قصبے پر سے گزرے جہاں سے گھوڑوں پر سوار کئی عورتیں کاندھوں پر کلہاڑیاں رکھے آپس میں باتیں کرتی جا رہی تھیں۔

"یہ کون ہیں؟"

پری نے پوچھا؟

"بھنڈ قوم کی عورتیں ہیں۔"

میں نے جواب دیا۔

"یہ اندھیری راتوں کو گھوڑوں پر سوار ہو کر چوری کرنے نکلتی ہیں۔"

"تمہارا دیس بہت نرالا ہے۔"

پری نے پیار سے کہا۔

"ہاں نرالا بھی اور پیارا بھی۔"

میں نے جواب دیا۔

اور پھر میں نے نیچے نظر ڈالی ہمارا تخت اب اجاڑ میدانوں پر سے گزر رہا تھا جہاں کے ایک اجاڑ سے گاؤں کے فقیر عید کے دن' فرشتوں کی طرح سفید کپڑے پہنے' گھوڑوں پر سوار ہو کر گاؤں میں نعتیں وغیرہ پڑھتے جاتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو ان کے دیس کی صدیوں پرانی تاریخ اسطرح حفظ ہے جس طرح حافظ کو قرآن پاک۔ پھر ہم ان ریتیلے میدانوں اور ریت کے ٹیلوں کے اوپر سے گزرے' یہاں سرکنڈوں سے بنی ہوئی جھونپڑیوں میں بسنے والے چرواہے اپنے دیس کے قومی شاعر کے بیت اور وائیاں اس طرح محبت اور سوز سے سازوں پر گاتے ہیں جیسے روم کے عیسائی پادری انجیل پڑھتے ہیں۔ جب ہم ان جھونپڑیوں کے اوپر سے گزرے تو کوئی چرواہا کسی "وائی" کے بول' بڑے پرسوز آواز میں گا رہا تھا۔

اس کی آواز میں اتنا کرب اور دکھ تھا کہ ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

پیار کی پری نے وہی بول دہرائے میں نے اس کی طرف پیاسی نظروں سے دیکھا۔ اس نے پیار بھری نظر مجھ پر ڈالی میں نے اس کے قوس قزح بالوں پر ہاتھ پھیرا اور اسے قریب کر کے پیار کرنے لگا۔ کئی پل گزر گئے۔ چاند پہلے سے زیادہ روشن ہو گیا اور پھر اس کی روشن کرنیں پیار کی اس پری کے سفید اور ملائم گالوں پر پڑنے لگیں۔"

پروفیسر نے بجھے ہوئے پائپ کو دوبارہ سلگایا اور کہنا شروع کیا۔

"پھر ہم مشرق کی طرف اڑنے لگے۔ گاؤں کے گاؤں گزر گئے۔ شہر آتے اور گزرتے گئے اب ہم کسی گاؤں کے اوپر تھے۔ اس گاؤں میں عورتیں شادی کے گیت گا رہی تھیں اور دوسرے گاؤں میں لوگ ایک تازہ کھدی ہوئی قبر میں مردے کو اتار رہے تھے' سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کچھ لوگ تو بین کر کے رو رہے تھے' جب ہمارا تخت ان کے اوپر سے گزرا اور موروں کی آنکھوں سے ٹپکنے والے شبنم کے قطرے ان پر گرے تو ان میں سے ایک نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا "کمال ہے! آسمان پر کوئی چھوٹی سی بدلی بھی

نہیں ہے پھر بھی بارش ہو رہی ہے۔" اس کی بات سنکر دوسرا بولا۔ "تم بات کو نہیں سمجھ رہے کہ یہ تو مرحوم پر اللہ کی رحمت برس رہی ہے۔" یہ سن کر سب کے چہرے کھل اٹھے۔

یہ منظر دیکھ کر پیار کی پری مسکرا دی اور کہا.....

"تمہارے دیس' گاؤں اور گاؤں والے بہت دلچسپ ہیں اور خوش نصیب بھی۔"

"وہ کیسے؟"

"دیکھو ایک غیر متوقع لیکن معمولی سی بات نے ان کو خوش کر دیا ہے۔"

"دور سے ہر پہاڑ اچھا اور خوبصورت لگتا ہے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"تم نے ان کی قریبی زندگی نہیں دیکھی ہے۔"

"چلو اگلا گاؤں آئے تو وہاں کے باسیوں کی زندگی کو قریب سے دیکھیں گے۔"

پیار کی پری نے مجھے دیکھا اور پھر تخت کو نیچے اتار دیا۔

آگے ایک گاؤں آیا جس کے ایک گھاس پھوس کے بنے ہوئے گھر کے آنگن میں دو عورتیں چکی پیس رہیں تھیں اور تھوڑی دور ایک بوڑھا شخص ہری گھاس چارے کے لیے کاٹ رہا تھا۔ چکی کے پاس بیٹھی لڑکی نے بوڑھی عورت سے جو اسکی ماں لگ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ "اماں ادا (بھائی) کو ہمارے یہاں سے گئے چوتھا سال ہے۔ اتنے عرصے میں اس نے پیسے تو کیا' کبھی ہم کو سلام دعا کے دو لفظ بھی نہیں لکھے۔" یہ بات سن کر بوڑھی عورت نے دکھی آواز میں جواب دیا۔ "میرا بچہ ایسا تھا تو نہیں پتہ نہیں اس ڈائن منڈم (میڈم) نے اس پر کونسا جادو کر دیا ہے کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے۔" بڑھیا کے الفاظ سن کر بوڑھے شخص نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ اب وہ ولایت جانے کی تیاری کر رہا ہے' کیونکہ کہتے ہیں کہ وہ منڈم (میڈم) کسی دوسرے ولایت کی ہے۔" یہ سن کر بڑھیا سسک سسک کر رونے لگی' اور کہا "ہم نے کتنی تکلیفیں سہہ کر اسے پالا پوسا اور بڑا کیا۔ کیا وہ سب دکھ اسی دن کے لیے سہے تھے؟ میں نے تو ان لوگوں کی بھی چاکری کی تھی جن سے سیدھے منہ بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا اور جب اس نے میٹرک (میٹرک) کے امتحان کی پھس (فیس) کے پیسے مانگے تھے تب اس کے باپ نے "ملیرو" اور "گلو" (بیلوں کے نام) بیچ کر اس کو پیسے لا کر دیئے تھے۔" بڑھیا یہ کہہ کر پھر سسکنے لگی۔ موروں کی آنکھوں سے شبنم کے قطرے گر کر اس کے چاندی جیسے بالوں میں جذب ہو گئے۔۔۔۔۔ اور ہمارا تخت آگے بڑھ گیا۔

"یہاں تو صرف آنسوؤں سے بھری آنکھیں ہیں۔"

پیار کی پری نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "واپس چلتے ہیں۔ مجھ سے دکھ دیکھا نہیں جائے گا۔"

ہمارا تخت واپس مڑا کتنے ہی گاؤں راستے میں آئے۔ پھر ہم ایک شہر میں آئے۔

"یہاں نئی تہذیب یقیناً خوشی اور خوشحالی لائی ہو گی؟"

پیار کی پری نے پوچھا۔

"دیکھنا چاہیے۔"

میں نے جواب دیا۔

"ہاں"

پیار کی پری نے مجھ سے متفق ہوتے ہوئے تخت نیچے اتارا۔

سامنے ایک عالیشان عمارت تھی جس میں بہت سے نوجوان جوڑے مغربی موسیقی کی کسی مشہور اور مقبول دھن "راک۔ این۔ رول" کی تال پر ناچ رہے تھے۔ مردوں نے عجیب سا لباس پہنا ہوا تھا۔ عورتیں مخملی لباس میں عریاں ہی نظر آ رہی تھیں۔ جب ناچ ختم ہوا تو ایک نوجوان عورت عجیب انداز سے میاں سے بولی۔

"میں تو اب تھک گئی ہوں۔ چلو اب ڈنر کھائیں۔"

مرد نے جواب دیا۔

"آج میرا دل چاہ رہا کہ چینی کھانے کھائیں' یورپین کھانے میں تو کوئی مزہ ہی نہیں ہے۔"

دونوں چینی کھانے کی تلاش میں نکل پڑے جو کہ انہیں نزدیک کے ایک ہوٹل میں تیار ملا۔ یہ دونوں تھوڑی دور باغ میں رکھی میزوں میں سے ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ بیرا ان کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ مرد نے کھانے کا آرڈر دیا۔

"چکن اینڈ رائس' سوپ دتھ تو ڈاس' فرائیڈ فش' ویجیٹیبل سلاد' چکن ہنڈ بڑی' پران فرائیڈ رائس' بریڈ' بٹر اینڈ پڈنگ رائس۔"

کھانا آیا اور جب کھا لیا تو پڈنگ کی ڈش ان کے سامنے آئی۔ عورت نے ماتھے پر تیوریاں ڈال کر کہا۔

"تم کو ہزار بار کہا ہے کہ مجھے پڈنگ اچھی نہیں لگتی ہے۔ میں کوئی دوسری سوئیٹ ڈش کھاؤں گی۔"

اور پھر بیرے سے کہنے لگی۔

"ا سپ پائی"

یہ سن کر پتہ نہیں کیوں اچانک ہی میاں کا چہرہ اتر گیا اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ (شاید اسے خیال آ گیا تھا کہ جس وقت اس کی بیوی نے ا سپ پائی کا آرڈر دیا تھا تو کیا پتہ اس وقت میلوں دور ایک گاؤں میں ایک گھاس پھوس کے بنے ہوئے گھر کے آنگن میں اس کی ماں اور بہن چکی سے اٹھ کر سوچتی ہونگیں کہ دوسرے دن سوکھا ساگ ہانڈی میں ڈالیں یا پھر روکھی سوکھی روٹی کھا کر گزارا کرلیں۔)

ہمارا تخت آگے بڑھ گیا اور شہر پیچھے رہ گیا۔ میں نے پیار کی پری سے کہا۔

"ایسی میڈم کس کام کی جس کی وجہ سے انسان ان کو بھلا دے' جن کا وہ خون ہے' جن کے جسم سے اس کا جسم بنا' جن ہڈیوں سے اس کی ہڈیاں جڑی ہوئی ہیں۔"

"بے شک یہ حماقت ہے۔"

وہ کہنے لگی۔
"جو انسان ماں باپ کی خبر گیری نہ کرے اس سے کوئی اور توقع کیا رکھ سکتے ہیں۔" کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔
"مگر عقل اور ظاہری پیار کرنے والے صرف منہ پر میٹھے ہوتے ہیں اور سونے جیسا دل رکھنے والے نا صرف ماں باپ' بھائی بہن' دوست اور محبوب کے لیے بلکہ ہر انسان کے لئے پیار اور عزت رکھتے ہیں۔"
"لیکن یوں تو پیار اور محبت ہر انسان کے دل میں ہوتا ہے۔"
"ایک ہی بات ہے لیکن پھر بھی سچی محبت کرنے والے وہ ہوتے ہیں' جو اپنی ذات سے تھوڑا آگے نکل کر میں جو دکھ لیکر سکھ بانٹیں۔ ایسے انسان پارس ہوتے ہیں۔"
"ایسی محبت اور قرار تو شاید صرف آسمانی "پری" سے ہی مل سکتا ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کہا۔ "میڈم وغیرہ کو تو اگر " اچھی پالی" کے بدلے پڑنگ ملے تو ملا کی طرح منہ بنا لیں گی۔"
پیار کی پری نے جواب دیا۔ "ایسا نہیں ہے جب آسمانی مخلوق کا دل گھبراتا ہے تو وہ انسانی روپ میں ہی دنیا میں آتے ہیں۔"
"تم بھی آتی ہو۔"
میں نے اس سے پوچھا۔
ہاں لیکن سینکڑوں سالوں کے بعد ایک دفعہ۔۔۔۔ کبھی کسی "سوہنی " کے روپ میں کبھی "میراں" کے روپ میں کبھی "سسی" کے روپ میں آتی ہوں۔"
"میں تمہارا انتظار کروں گا۔"
میں نے تخت سے اترتے ہوئے جواب دیا۔
"میں ضرور آؤں گی۔"
اس نے اقرار کیا۔ "لیکن جب تک میں تمہیں دھرتی پر ملوں' اس وقت تک تم مجھے آسمان میں ڈھونڈنا۔ میں ستارے کے روپ میں سورج غروب ہونے کے بعد مغرب کی طرف اور سورج ابھرنے سے پہلے مشرق کی طرف آسمان پر ظاہر ہوتی ہوں۔ کوئی مجھے وینس کہتا ہے' کوئی زہرہ' لیکن آپ کی زبان میں اسے "دھالو" (صبح کا تارا) کہا جاتا ہے۔
صبح کاذب ہوئی پیار کی پری نے رخصت ہونے کی تیاری کی۔ ہم واپس آئے صبح کے ہلکے اندھیرے میں ہم نے آخری دفعہ پیار بانٹا اور پھر پیار کی پری دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئی۔ میں اپنے کمرے میں کھڑا اس کے تخت کو جاتا دیکھتا رہا' جو دھیرے دھیرے آسمان کی نیلاہٹ میں گم ہوتا گیا پھر میں اپنے بستر پر آکر لیٹ گیا لیکن آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ اس دن سورج ابھرنے سے پہلے اٹھا۔ میں نے پیار کی پری کو مشرق کی طرف آسمان میں دیکھا۔۔۔۔ اس کے بعد روزانہ شام کو سورج ڈوبنے کے بعد مغرب

کی طرف آسمان پر اس کو دیکھتا ہوں مجھے یقین ہے کہ ایک دن وہ ضرور میرے پاس آئے گی۔"

پروفیسر نے بات پوری کر کے' پائپ میں تمباکو بھرا اور پھر آسمان پر نگاہ ڈالی جہاں "وینس" چمک رہا تھا۔ وہ "وینس" کی طرف حسرت بھری نگاہ سے دیکھنے لگا اور "ہو مر" کے الفاظ دھرائے "جب تم دھرتی پر آتی ہو تو ہمارے پاس خوشی اور خوشحالی آتی ہے۔ بے شک تمہیں دیکھنا بھی زندگی ہے اور تم سے محرومی موت ہے۔ مشرق اور مغرب دونوں تم کو سلام کرتے ہیں۔ بے شک خوبصورتی تمہارے بنا بے معنی ہے۔"

پروفیسر چپ ہو گیا۔ لہریں سر پٹک رہی تھیں۔ میں نے سمندر کی لہروں پر نظر ڈالی سفید سفید جھاگ کنارے کی طرف تیرتا ہوا آ رہا تھا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا اور وینس کو گھورنے لگا۔ اس پروفیسر کی طرح جانے کتنے لوگوں کو اس پیار کی پری کا انتظار ہے لیکن نہ معلوم کس کو کب اور کہاں مل جاتی ہو گی ......اور پھر اس سے پہلے کہ میں پروفیسر سے رخصت ہونے کی اجازت لوں۔ ایک دم سے میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وینس کی طرف سے روشنی کی ایک کرن میرے پاس میرے سوال کا جواب لے کر آئی تھی۔

میں تو کوئی خیال ہوں
میں ملوں گی تمہیں خیالوں میں

غلام نبی مغل

رات کی آنکھیں

حنا آج صبح سے گھر کے کاموں میں معروف تھی۔ اتوار کا دن تھا گھر میں اس کے چھ سالہ بیٹے امجد کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ امجد بھی صبح سے گھر پر ہی تھا' باپ گھر پر موجود نہیں تھا ورنہ اس کے ساتھ مارننگ شو پر چلا جاتا۔ اب وہ ریڈیو پر کرکٹ کمنٹری سن رہا تھا اور ماں کو کھیل کی تازہ تازہ خبریں سناتا جارہا تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں تھی دونوں کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ بیچ میں دروازہ تھا اور ریڈیو کی آواز وہاں بھی جاری تھی' لیکن اسے ماں کو بتانے میں مزہ آرہا تھا۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ وہ محلے کے دوسرے بچوں کی طرح بے ہودہ کھیل نہیں کھیلتا۔ حنا نے سب سے پہلے ملازمہ کے ساتھ مل کر پہلے پورے گھر کی جھاڑ پونچھ کی۔ تین کمرے تھے برآمدہ اور چھوٹا سا آنگن تھا۔ ایک کمرہ خواب گاہ تھا جس میں ڈبل بیڈ تھا اس کے میاں کے پلنگ کے قریب چھوٹی سی راشنگ ٹیبل رکھی ہوئی تھی اور اس کے پلنگ کے سرہانے چھوٹی سی تپائی رکھی تھی جس پر دو تین دوائیوں کی شیشیاں اور ایک گلاس رکھا ہوا تھا۔ گلاس میں پانی تھا۔ جس کو اس نے باہر جاکر پھینک دیا حنا نے کمروں کا فرش دھویا اور ملازمہ نے برآمدہ اور صحن دھویا۔ برآمدہ اور صحن دھو کر ملازمہ نے گملوں کو پانی دیا' پھر برتن دھونے بیٹھی۔ تین گملے صحن میں اور دو برآمدے میں رکھے ہوئے تھے دو گملوں میں گلاب کے پودے تھے'ایک میں چنبیلی' دو میں موتیا کے پودے تھے۔ ملازمہ نے برتن دھونے شروع کئے کچھ برتن تانبے کے تھے' باقی چینی کے تھے جن پر سے چکنائی اتارنے کے لئے اس نے گرم پانی اور وم استعمال کیا۔ اندر کمرے میں حنا نے سوفوں کا رخ تبدیل کر دیا پہلے وہ شمال مغربی کونے میں رکھے ہوئے تھے اب ان کا رخ جنوب مغرب کی طرف کر دیا۔ دونوں شوکیس اسی جگہ پر تھے۔ دروازوں کے پردے میلے ہورہے تھے' وہ بھی سب تبدیل کئے۔ اسے ہلکے نیلے پردے اچھے لگتے تھے۔ امجد کی آنکھیں بھی ہلکے نیلے رنگ کی تھیں۔ یہ وہ خود کہتی تھی اور اس کے شوہر منصور کو بھی ہلکا نیلا رنگ پسند تھا۔ منصور اسے کافی دنوں سے کہہ رہا تھا کہ ہلکے گلابی پردے اتار کر نئے پردے لگائے۔ اس نے سوچا کہ رات کو مہران ایکسپریس سے جب منصور حیدر آباد آئے گا تو پردے دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔ ان کی خواب گاہ میں رات کو ہلکا نیلا بلب بھی جلتا تھا۔ ملازمہ نے کھانے کی میز پر کھانا رکھ کر اسے اطلاع دینے آئی' وہ اپنی خواب میں بیٹھی ہوئی تھی اور ریڈیو کراچی سے گانے سن رہی تھی۔ ریڈیو سامنے منصور کے میز پر رکھا ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر کھانے والی میز کے پاس آئی امجد بھی آیا۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ کوفتے اور مٹر کی سبزی تھی۔ کھانا کھاتے

ہوئے حنا نے سوچا کہ اب وہ خریداری میں مصروف ہوں گے...... ٹیکسی چھوڑ کر رکشے کو پکڑا ہوگا' دوکان سے اتر چڑھ رہے ہوں گے۔ سامان خرید رہے ہوں گے۔ امجد نے کھانا کم کھایا اور کنٹری زیادہ سنی۔ جس وقت پاکستان کا اوپنگ بیٹسمین آؤٹ ہوا تو کھانا چھوڑ کر ریڈیو کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ صبح سے کوئی بھی آؤٹ نہیں ہوا تھا۔ امجد یہ سوچ کر ریڈیو کے قریب بیٹھ گیا کہ اب کوئی بھی آؤٹ نہیں ہوگا۔ حنا نے کھانا کھا کر کرسی کو پیچھے کھسکا کر بڑی نفاست سے اٹھی اور کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئی۔ برآمدے میں دھوپ آچکی تھی وہ برآمدے سے نکل کر صحن میں آئی۔ دھوپ کی وجہ سے اس کی آنکھیں نیم وا ہوگئیں۔ جنوب مغرب کی طرف باورچی خانے کے قریب لگے ہوئے نلکے کے پاس آئی اور لکس صابن کی سفید ٹکیہ دونوں ہاتھوں پر ملی' ہاتھ دھو کر دو دفعہ کلی کی۔ کلی کے ذریعہ چکنی روٹی کے ذرات نکلے پھر وہ صحن سے گزر کر برآمدے میں آئی اور برآمدے میں رکھے ہوئے لکڑی کے اسٹینڈ پر پڑے ہوئے تولیے سے ہاتھ منہ صاف کیا۔ لمبی سانس لے کر اندر کمرے میں آئی تو امجد کو ریڈیو کے پاس بیٹھا ہوا دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی امجد نے اپنی ہلکی نیلی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ حنا کو ہلکے نیلے پردے یاد آئے اور منصور یاد آیا۔ جو "حنا" کے ساتھ صبح سے کراچی گیا ہوا تھا۔ وہ اپنی خواب گاہ میں آکر پلنگ پر لیٹ گئی' جس طرف منصور سوتا تھا وہ اس طرف اوندھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے پائنچے گھٹنوں سے اوپر ہوگئے' جس سے اس کی سفید سفید ٹانگیں چمک رہی تھیں وہ اسفنج کے تکئے پر کہنیاں ٹکائے سامنے دیوار کو گھورنے لگی اور ساتھ ساتھ سوچ رہی تھی کہ منصور اور حنا صبح نو' سوا نو بجے کینٹ اسٹیشن پہنچے ہوں گے۔ اسٹیشن کی دو عذاب دیتی سیڑھیاں اترنے اور چڑھنے کی وجہ سے کافی تھک گئے ہوں گے اور جب ٹکٹ دکھا کر باہر آئے ہوں گے تو حنا نے کہا ہوگا۔

"ادا (بھائی) میں تو تھک گئی ہوں......"

تو منصور نے ہنس کر جواب دیا ہوگا۔

"میں کوئی لوہے کا بنا ہوا ہوں کیا؟......"

"آپ تو مرد ہیں آخر۔"

حنا نے عورتوں والا جواب دیا ہوگا۔ منصور کو تو ویسے بھی زیادہ بات کرنے والی عورتیں اچھی نہیں لگتیں' میں اسے جانتی ہوں۔ اس کا اصول ہے کہ اگر عورتیں کم باتیں کریں تو پتہ نہیں کتنے کاموں میں مردوں سے بازی لے جائیں' کیونکہ عورتیں کسی بھی طرح سے مردوں سے کم نہیں ہوتیں۔ امتحان کے رزلٹ دیکھیں تو لڑکیوں کے نمبر لڑکوں سے زیادہ ہوتے ہیں..... خیر اسٹیشن سے باہر آکر ٹیکسی میں صدر کے کسی ریسٹورنٹ میں گئے ہوں گے ناشتہ تو یہاں سے کرکے گئے تھے لیکن بھوک ضرور لگی ہوگی کیونکہ تین گھنٹے کا سفر ہے۔ ریل کے دھکے اور ایک جگہ بیٹھے رہنا مشکل کام ہے۔ ناشتہ کرکے کچھ دیر بیٹھے ہوں گے۔ منصور نے تو ہاف فرائی انڈا اور مکھن توسٹ کھایا ہوگا' باقی حنا کا پتہ نہیں ہے۔ ہے تو میری چچا زاد کی خالہ زاد بہن اور اس کے ساتھ دوستی بھی بہت ہے۔ بالکل بہنوں کی طرح ہے لیکن کھانے کے معاملے میں عجیب ہے۔ اس کو کوئی خاص چیز پسند نہیں ہے' جو ملتا ہے کھا لیتی ہے لیکن ہے نفاست پسند۔ سارا دن گھر کی صفائی میں

گی رہتی ہے۔ آخر کانونیٹ کی پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ ہم سے بھی دو قدم آگے ہے لیکن ہے محبت کرنے والی بالکل مصری کی میٹھی ڈلی کی طرح۔ بات کرنے کا بھی خوب سلیقہ ہے اسے۔ بات کرتے ہوئے جب تک دو تین انگریزی کے لفظ نہیں جوڑتی تب تک اپنی بات کا مطلب نہیں سمجھا سکتی۔ کہتی ہے بھئی کیا کروں۔ جب تک انگلش ورڈز یوز نہیں کروں تب تک اپنی بات ہی ایکسپلین نہیں کر سکتی۔ پلیز میرا مذاق مت اڑایا کریں۔

حنا کو اپنی چچا زاد بہن کی خالہ زاد بہن حنا کے متعلق سوچ کر ہنسی آرہی تھی دونوں کے نام ایک جیسے تھے اور آپس میں گہری دوستی بھی تھی۔ حنا کو حنا اس لئے بھی اچھی لگتی تھی کیونکہ وہ دوسروں کی طرح بدتمیز اور بے حیا نہیں تھی۔ بہت سلجھے ہوئے خیالات کی لڑکی تھی۔ حنا اسے ہم عمر ہونے کا ناطے چھوٹا سمجھتی تھی۔ لیکن وہ کوئی چھوٹی لڑکی نہیں تھی۔ اس کی شادی آج سے پانچ سال پہلے ہوگئی تھی۔ اسے ایک بچہ بھی ہوا تھا لیکن وہ ایک مہینہ بھی زندہ نہ رہا۔ اس کا شوہر بھی دو سال ہوئے ایک حادثہ کا شکار ہوکر مر گیا تھا اس وجہ سے بھی ان کی دوستی گہری ہوگئی تھی۔ ویسے بھی حنا کو حنا سے بے حد محبت تھی کیونکہ اس کی شکل بھی اس کی چھوٹی بہن سے کافی ملتی تھی۔

کمرے میں لگے ہوئے وال کلاک نے تین بجائے اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا..... خریداری تو دونوں نے کر لی ہوگی۔ اب دو بجے کے قریب کسی اچھے ریسٹورنٹ میں کھانا بھی کھایا ہوگا........ اس سے پہلے الفسٹن اسٹریٹ' بوری بازار' بندر روڈ کے چکر کاٹنے ہوں گے منصور تنگ بھی بہت ہوا ہوگا۔ ایک چیز کے لئے دس دکانوں کے چکر کاٹنے سے منصور چڑتا ہے۔ وہ جس دکان پر جاتا ہے تقریباً ساری چیزیں وہیں سے خریدتا تھا لیکن آج اس کے ساتھ حنا ہے اور اس کی عادت ہے کہ جب تک بازار کی ساری دوکانوں سے قیمت نہ پوچھ لے تب تک کوئی چیز نہیں خریدتی۔ منصور ضرور بور ہو رہا ہوگا.....

حنا ہنسنے لگی۔ کس نے کہا تھا کہ اس مصیبت کے ساتھ کراچی جاؤ اب تو توبہ کرے گا۔

حنا بولتی بھی تو بہت ہے۔ منصور ایک بات سن کر دوسری بات سننا پسند نہیں کرتا اور تیسری بات سننے سے تو صاف انکار کر دیتا ہے۔

اپنی اپنی طبیعت ہوتی ہے۔ خیر خود ہی رات کو آکر بتائے گا۔ سب حنائیں میری طرح تھوڑی ہوتی ہیں۔ حنا نے بندر روڈ پر ضرور تنگ کیا ہوگا۔ وہاں دوکانیں بھی بہت ہیں۔ تنگ سی گلیاں ہیں۔ عورتوں کا ہجوم ہوگا جن سے منصور بہت تنگ ہوتا ہے۔ الفنسٹن اسٹریٹ پر بھی بور ہوا ہوگا۔ حنا کی عادت ہے جب تک کسی چیز کی قیمت کم نہیں کرواتی خریدتی ہی نہیں اور منصور کو یہ عادت اچھی نہیں لگتی۔ مجھے تو افسوس ہورہا ہے کہ بہت بور ہورہا ہوگا لیکن اچھا ہے اسے سزا ملنی چاہیے' آئندہ تو اس طرح کراچی نہیں جائے گا۔ حنا کو اپنی بہن کے جہیز کے لئے ساڑھیاں اور دوسرے کپڑے خریدنے تھے تو وہ خود ہی کوئی بندوبست کرتی۔ اس کو کیا ضرورت تھی کہ ساتھ گیا۔ خیر ایک دن کی تو بات ہے۔ اچھا ہے چکر لگا کر آجائے گا' یہاں گھر میں بیٹھا ہی رہتا یا پھر مارننگ شو دیکھنے چلا جاتا۔ میں بھی ساتھ کراچی چلی جاتی اچھی تفریح ہو جاتی لیکن آج امی کو آنا

تھا۔ شام تک آئیں گی پہلے بھی دو تین دفعہ آئیں تھیں لیکن میں گھر پر نہیں تھی۔ آج بھی اگر انہیں نہ ملتی تو ناراض ہو جاتیں۔

حنا پلنگ پر لیٹے لیٹے سو گئی ہے۔ جب وال کلاک نے ساڑھے تین بجائے تو حنا سے سوچا...... اب وہ لوگ پکچر ہاؤس میں بیٹھے ہوں گے۔ منصور تو پکچر ہاؤس ضرور جائے گا اور اس نے یہ کوشش کی ہوگی کہ حنا کی خریداری پکچر ٹائم سے پہلے ختم ہو جائے۔ پکچر بھی "کلوپیٹرا" ہے اسے بھلا کون دیکھنا نہیں چاہے گا۔ حنا کو فلموں کا اتنا شوق نہیں ہے۔ منصور کی خاطر مجبوراً چلی گئی ہوگی' ورنہ اس کا دل تو چاہتا ہوگا کہ سارا دن خریداری کرتی پھرے۔ منصور نے بھی سارے دن کی تھکن ائرکنڈیشن ماحول میں بیٹھ کر اتاری ہوگی۔ بہت تھک گیا ہوگا لیکن وہ کلوپیٹرا دیکھنے نہیں گئے ہوں گے کیونکہ وہ تو کافی لمبی فلم ہے۔ ان کو سات بجے مہران ایکسپریس سے واپس آنا ہے اور کلوپیٹرا ساڑھے سات بجے ختم ہوگی۔

حنا کو نیند آنے لگی۔

"اما' اما... حنیف آؤٹ ہوگیا۔"

امجد چیخا۔

حنا کو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ حنیف بیٹنگ کر رہا ہے یا کوئی دوسرا اسے نیند آرہی تھی وہ سو گئی۔

چار بجے

پانچ بجے...... حنا کی ماں اور بھابیاں آئیں۔

چھ بجے۔

سات بجے تو حنا کی ماں اور بھابیاں جانے کی تیاری کرنے لگیں کیونکہ ان کو آج جلدی گھر جانا تھا۔

آٹھ....... ساڑھے آٹھ اور نو بج گئے تو وہ لوگ چلی گئیں۔

جب نو بجے تو حنا کو یہ سوچنے کا موقع ملا کہ مہران ایکسپریس تو بہت تیزی سے چلتی ہے' باقی پون گھنٹہ ہے۔ دور سے تھک کر آئیں گے۔ وہ اکیلی اکیلی بیگانوں کی طرح گھر میں گھومتی رہی۔ امجد ہوم ورک کرکے سوچکا تھا۔ حنا نے ابھی سلیپنگ سوٹ بھی نہیں تبدیل کیا تھا۔ شام کو نہانے کے بعد اس نے بالوں میں کنگھی بھی نہیں کی تھی۔ اس کے کھلے ہوئے بال کندھوں پر پڑے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک کی ہلکی تہہ ابھی تازہ لگ رہی تھی۔ وہ اپنی خوابگاہ میں پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ منصور یا حنا نے پوچھا تو کہوں گی۔ سارا دن کام کرکے تھک گئی ہوں۔ اگر آپ لوگوں کا انتظار نہ ہوتا تو آج آٹھ بجے ہی سو جاتی' سارا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ یہ سوچ کر حنا نے انگڑائی لی۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ حنا نے منصور کے پلنگ کے پاس رکھی ہوئی میز کی دراز کھولی۔ اس میں ڈائریاں اور دو تین خط رکھے تھے وہ نکال کر دیکھنے لگی۔ اچانک اس کی نظریں ایک خط پر پڑیں لکھا تھا..... "پیاری حنا" یہ پڑھ کر مسکرا دی' مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔ حنا پلنگ پر لیٹ گئی اور اپنی زبان سے دھرانے لگی۔ "حنا....... پیاری حنا" اس نے آنکھیں بند کرلیں...... اب مہران حیدر آباد کے اسٹیشن پر پہنچ گئی ہوگی۔ منصور اور حنا بھی اسٹیشن سے باہر آگئے ہوں گے اور اب رکشہ پر بیٹھ کر

کی طرف روانہ ہوں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد ساتھ والے مین روڈ پر گاڑیوں کی آواز آنے لگی۔ حنا سمجھ گئی کہ اسٹیشن سے آتی ہوئی گاڑیاں ہیں۔ ایک رکشا اس کے گھر والی گلی میں مڑا لیکن پھر آگے نکل گیا۔ ایک دوسرا رکشہ تیز تیز آیا اور گھر کے قریب رکا لیکن اس میں منصور اور حنا نہیں تھے۔ رکشے میں سامنے والے گھر کا لمبا داڑی تھا جو صبح سے کراچی گیا تھا۔ وہ بھی آ گیا' پتا نہیں وہ لوگ کیوں نہیں آئے' کوئی حادثہ تو نہیں ہوگیا کہیں۔ خدایا خیر کرنا۔ آج کل کراچی میں رکشا' موٹر اور بسیں کتوں سے بھی زیادہ ہوگئی ہیں اور ڈرائیور اتنے لاپروا ہیں' جیسے دنیا میں اکیلے یہ خود ہی رہتے ہیں۔ میں تو جب بھی کراچی کے راستوں پر سے گزرتی ہوں تو سانس مٹھی میں ہوتی ہے۔ منصور تو ہے ہی لاپروا اور پھر حنا بھی لاپروائی میں کم نہیں ہے۔ زندگی سے اسے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ موت ضرور ایک دن آئے گی لیکن زندگی دوبارہ تھوڑی ہی ملے گی۔ موت کے ایک دن آنے کا ڈر نہیں ہے لیکن زندگی دوبارہ نہیں ملے گی اس کا اسے کوئی دکھ نہیں ہے۔ انسان بھی کیا ہے؟ راکٹ کے ذریعہ چاند تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن ایک مچھر کے کاٹنے سے پریشان ہوجاتا ہے۔ کیڑے کے بستر ہوتے ہیں اور گرے کا کوئی نہیں ہوتا' زندہ انسان خود کو سب سے اونچا تصور کرتا ہے۔ مرنے کے بعد تو دوسروں کے کندھے کا محتاج بن جاتا ہے' نہیں تو وہی انسان جو صفائی ستھرائی کا اتنا خیال کرتا ہے' مرنے کے بعد اپنے گوشت میں کیڑوں کو چلتا ہوا بھی نہیں دیکھ سکتا...... حنا کو فکر ہونے لگی کہ پتہ نہیں کیوں وہ لوگ مہران سے نہیں آئے۔ ایسی کوئی لمبی چوڑی خریداری بھی نہیں کرنی تھی' یہی کوئی چار پانچ ساڑھیاں اور کچھ دوسرے کپڑے اور سامان لینا تھا۔ اس کے علاوہ منصور کو صبح آفس بھی جانا ہے۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیال آرہے تھے۔ وہ بستر سے اٹھی ایک چکر پورے گھر کا لگایا پھر واپس آکر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

اسے لیٹے ہوئے بھی کافی دیر ہوگئی تھی اب اسے احساس ہوا کہ گیارہ بج گئے ہیں۔ اس نے سمجھ لیا کہ آج وہ لوگ نہیں آئیں گے تو وہ بتی بجھا کر پھر لیٹ گئی۔ کمرے میں اندھیرا تھا وہ پلنگ کے بیچ میں لیٹی تھی۔ سر کے نیچے تکیہ تھا۔ کمرے کی بھرپور خاموشی میں اس کی سانس مدھر موسیقی پیدا کر رہی تھیں۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ کیوں نہیں آئے؟ یہ تھا سوال جو اس کے جسم کے ذرے ذرے کو زیربار کررہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک دوسرا سوال بھی آیا..... منصور کا خط جو پیاری حنا سے شروع ہوا تھا جو اس نے شام کے بعد دیکھا تھا۔ وہ منصور نے جانے کب لکھنا چاہا تھا۔ یہ سوال اس کے ذھن میں وسوسے پیدا کر رہا تھا۔ "پیاری حنا کون ہے۔" میں یا وہ حنا جو منصور کے ساتھ کراچی گئی ہے بہن کے جہیز کے لئے کچھ سامان خریدنے؟ جس کے ساتھ آج منصور کو واپس آنا تھا۔ جس کے ساتھ منصور کراچی میں رک گیا تھا۔ مجھے خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن منصور نے وہ خط کیوں لکھا تھا۔ جس کو پورا بھی نہیں کر سکا تھا۔ شاید...... ہوسکتا ہے جو باتیں منصور حنا سے خط کے ذریعہ کرنا چاہتا ہو۔ وہ آج رات کراچی میں رہ کر کہے۔ ہو سکتا ہے کہ حنا نے بھی اصرار کیا ہو کہ آج رات کراچی میں رہ جائیں۔ رشتہ داروں کے پاس منصور نہیں جائے گا۔ حنا بھی اپنے جاننے والوں کے پاس نہیں لے جائے گی۔ ضرور کسی ہوٹل میں رہیں

گے۔ اکیلے۔ اکیلا کمرہ۔ اکیلا شہر..... تعجب کی بات ہے کہ حنا نے کب منصور کو اپنے جال میں پھنسایا اور مجھے تو پتہ بھی نہیں چلا وہ آخر نئے زمانے کی لڑکی ہے۔ مردوں کو اپنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔ کیسے بن سنور کر گئی تھی بھلا ٹرین میں بھی کوئی اتنا بن سنور کر جاتا ہے۔ اتنے چست کپڑے وہ بھی نشو کے۔ پورا جسم نظر آرہا تھا۔ میں نے پوچھا بھی تھا کہ صبح صبح "کس می" کیوں لگا رہی ہو؟ کہنے لگی ٹرین کی ہوا لگنے کی وجہ سے ہونٹ سوکھ جاتے ہیں۔ ہاں۔ اگر ہونٹ سوکھ گئے تو پھر منصور کیسے پیار کرے گا۔ ضرور "کس می" کی خوشبو اور رنگ نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا ہوگا۔ حنا جیسی تو ہیں ہی مرد مار عورتیں۔ ان کے پاس مردوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لئے ہزار طریقے ہوتے ہیں وہ کنواری بھی نہیں ہے کہا جائے کہ بھئی کنواری لڑکی ہے اور کرتوت دیکھیں۔ نہ ہی شوہر زندہ ہے کہ کوئی کہے کہ میاں ایک جگہ رہتا ہے اور بیوی دوسروں کے ساتھ گھومتی ہے۔ آزاد خیال..... نہ اپنی پروا نہ زمانے کی باتوں کا کھٹکا۔ منصور جیسے تو پتہ نہیں کتنے اس کی بڑی بڑی آنکھوں اور مسکراہٹ پر قربان ہوچکے ہوں گے۔ جسم بھی بھرا بھرا اور رنگ بھی گورا ہے اور کیا چاہیے منصور کو۔ جسم پھر کیسا ہے..... جیسے بوری! تھوڑا قد چھوٹا ہوتا تو اتنی بدصورت لگتی کہ ہر کوئی "ڈائن" کہتا' لیکن قد آور ہے اونٹ کی طرح جسم بیڈول ہے۔ حنا کے ذہن میں خیالات کباب کی سیخوں کی طرح گھوم رہے تھے۔ ہر ایک خیال حسد کی آنچ میں بھاپ بن کر اس کے ذہن میں تیر رہا تھا۔ وہ بے چینی سے پلنگ پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ میٹنی شو کے بعد وہ لوگ ضرور کہیں گھومنے گئے ہوں گے۔ کلفٹن یا؟........ ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آپس میں جڑے بیٹھے ہوں گے اور آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہوں گے۔ ٹیکسی والا بھی سارا تماشا دیکھ رہا ہوگا ایسی باتوں میں وہ بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ وہ ضرور سمجھ جائے گا کہ وہ اس لڑکی کو پھانس کر لایا ہے اور لڑکی کے متعلق اس کی کیا رائے ہوگی؟ وہی رائے جو عام طور پر اس طرح کی لڑکیوں کے متعلق ہوتی ہے' ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ اس میں منصور کی کتنی بے عزتی ہے۔ خیر منصور خان بھی خوش ہوگا کہ مفت کی ملی ہے وہ بھی مرد ہے۔ عورت کے الجھانے میں کیسے نہیں آتا۔ کلفٹن پر آج کی فلم پر اپنی اپنی پسند کا اظہار کریں گے اور شاید اپنی اس محبت کا اظہار بھی کریں گے جو ایک دوسرے کے لئے دل میں ہوگی.......

"تمہاری پتہ نہیں کتنی باتوں کے نشان میرے دل میں بکھرے ہوئے ہیں۔"

منصور کا مخصوص جملہ..... حنا اسے سن کر کھل جائے گی اور اس کے اور زیادہ قریب ہوکر چلے گی۔ دونوں ساتھ ساتھ چلیں گے پھر ہوں گی باتیں..... سامنے سمندر کی لہریں' آسمان' چاند تارے' رونق اور خاموشی..... رات کو ضرور کسی ہوٹل میں ٹھہریں گے اور کہاں جائیں گے۔ ایک دوسرے کو شوہر اور بیوی ظاہر کیا ہوگا۔ ایک ہی کمرے کی اکیلی فضا میں جب داخل ہوئے ہوں گے اور دونوں کی نظریں ملیں گی تو سب سے پہلے ایک دوسرے کی طرف بڑھے ہوں گے' ایک دوسرے کی آغوش میں سما جائیں گے جن کی جانے کب سے انہیں آرزو ہوگی۔ شاید اس خط سے بھی پہلے کی تمنا ہوگی۔ منصور نے حنا کو پیار کیا ہوگا وہی ہونٹ جن کو حنا خشک ہوا سے بچانے کے لیے صبح سے کوشش کر رہی تھی تو اس نے ضرور سوچا ہوگا کہ وہ

کتنا خوش نصیب ہے۔ بدنصیب تو میں ہوں جو ان کے ساتھ نہیں گئی لیکن اس کے باوجود اگر میں ساتھ ہوتی تو وہ اشاروں اشاروں میں باتیں ضرور کرتے۔ ساری رات نہیں سوئیں گے خیر صبح جب آئیں گے تو پتہ چل جائے گا۔

پوری رات جاگنے کی وجہ سے آنکھیں نیند سے بوجھل ہوں گی۔ ساری رات باتیں کریں گے.... ایک ہی بستر پر قریب قریب لیٹے ہوں گے۔ حنا کو بھی بہت سالوں کے بعد مرد کی قربت نصیب ہوئی ہوگی۔ بہت خوش ہوگی اور منصور بھی خوش ہوگا لیکن حنا جیسی عورتیں صرف کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھیں تو پتہ نہیں کتنے منصور مر جاتے ہیں لیکن منصور تو حنا کو پتہ نہیں کیا سمجھ رہا ہوگا۔

حنا ان خیالی باتوں کی آگ میں جلنے لگی۔ جسم کی رگ رگ میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ سانس تیز ہوگئی۔ پیشانی عرق آلود ہوگئی' دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے گزرا ہوا پل سوکن لگ رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وقت کو شام تک پیچھے دھکیل دیتی کیونکہ اس کے خیال میں منصور نے شام تک کوئی گناہ نہیں کیا ہوگا...... لیکن اب کیا کر رہے ہوں گے؟ یہ سوال حنا کے ذہن اور جسم میں عذاب بن کر چمٹ رہے تھے۔ وہ سوچنے لگی کیا قیامت میں اس سے بھی زیادہ کوئی عذاب ہوگا؟ اس کے جسم پر تو جیسے کھٹمل چل رہے تھے۔ اس نے ٹانگوں اور پیٹ کو کھجا کھجا کر زخمی کر لیا تھا۔ اس نے سرہانے رکھے لیمپ کو جلایا۔ اپنا پائنچا گھٹنوں سے اوپر کیا تو اس نے دیکھا کہ اس کے گوشت کے چاروں طرف ہلکی گلابی سفیدی کو حنا نے کھجا کھجا کر لال کر دیا تھا۔ اپنے ٹانگوں پر جمے ہوئے خون کے نشان دیکھ کر اسے حنا کے ہونٹ یاد آئے۔ ہونٹ جن کو صبح "کس می" سے لال کرکے گئی تھی جن کو وہ نزیں کی خشک ہوا سے بچا رہی تھی' جنے رات کو منصور کے سپرد کرنا تھا۔ حنا نے ٹیبل لیمپ بجھا دیا اور ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری۔ سانس لینے سے ایک لمحے کے لیے وہ پوری کانپ گئی اس کے جسم کی رگ رگ ڈرے ہوئے خرگوش کی طرح تھی۔ وہ ابھی تک ٹانگ کو کھجا رہی تھی' جیسے کس می کی ساری لالی وہ حنا کے ہونٹوں پر سے کھرچ کر اتار رہی ہو۔

حنا کو پتہ نہیں کس وقت نیند آگئی۔ جتنی دیر بھی نیند میں رہی تو عجیب و غریب خواب ہی دیکھے۔ خواب میں اسے محسوس ہوا جیسے وہ مرد تھی اور حنا کو اپنی آغوش میں لے کر وحشیانہ انداز میں پیار کر رہی تھی' اچانک حنا کے کس می لگے ہونٹوں کو چبا کے کھا گئی ہو.... تھوڑی دیر کے بعد پھر دیکھا کہ حنا بنی سنوری کھڑی ہے لیکن ہونٹ بالکل ہی نہیں ہیں۔ وہ یہ دیکھ کر سوچتی ہے کہ اس کی آنکھیں کتنی کشش والی ہیں...... صبح جلدی ہی اٹھ بیٹھی۔ امجد تو اسکول چلا گیا وہ پھر ملازمہ کے ساتھ گھر کی صفائی میں لگ گئی لیکن اب وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہی تھی۔ سوائے اس بات کہ اب وہ کہاں ہوں گے دوپہر کے لئے اس نے دو لوگوں کا زیادہ کھانا تیار کیا۔ وہ لوگ حنا اور منصور اسے پتہ نہیں کیوں یقین تھا کہ دوپہر تک وہ لوگ ضرور آجائیں گے۔

دوپہر کے کھانے تک منصور اور حنا پہنچ گئے دوپہر کا کھانا کم پڑ گیا کیونکہ منصور کی پھوپھی اور اس کا بارہ سالہ بیٹا بھی کراچی سے ساتھ آئے تھے۔ ان دونوں کے چہروں کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ دونوں

تھکے ہوئے ہیں۔ منصور کو بھوک بھی بہت زیادہ لگی تھی۔ اس لئے وہ کھانا کھانے لگا۔ حنا نے سوچا کمال ہے منصور کا پیٹ اب بھی خالی ہے۔ اسے حنا کے چہرے پر پہلے سے زیادہ رونق نظر آرہی تھی۔ وہ پہلے کی طرح ہنس نہیں رہی تھی لیکن بات بات پر صرف مسکرا رہی تھی۔ منصور جلدی جلدی کھانا کھا کر دفتر بھاگا۔ اب دونوں اکیلی رہ گئیں..... اور پھوپھی اور چھوٹا اختر۔ کھانا کھا کر وہ حنا کی خریداری دیکھنے لگی۔ چار ساڑھیاں اور دوسرا سامان دلہن کی لال رنگ کی ساڑھی حنا کو اچھی لگی۔ حنا اور منصور نے بتایا تھا کہ صرف اس ساڑھی کی خاطر رات کو رہنا پڑ گیا تھا' نہیں تو کل ہی واپس آتے کیونکہ دوکان دار نے کہا تھا۔ صبح سویرے ہی آپ کو یہ ساڑھی پہنچا دیں گے۔ حنا نے سوچا ساڑھی واقعی رات ٹھہر کر لینے جیسی تھی۔ دوسرے پھوپھی کو بھی حیدر آباد آنا تھا۔ انہوں نے ہی منصور کو روکا تھا۔ حنا نے سوچا کہ بہت اچھا ہوا کہ پھوپھی آگئیں کیونکہ ان سے ملے بہت دن گزر گئے تھے پھر جلد ہی حنا اپنے گھر چلی گئی۔

رات کو منصور اور حنا اپنے اپنے پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ حنا کل رات کی باتیں شاید بھول گئی تھی۔ منصور نے چھت کی گھورتے ہوئے کہا۔

"خدا تعالٰی نے عورت کو نہ جانے کس مٹی سے بنایا ہے؟"

"کیوں؟" حنا نے اس طرف کروٹ لے کر کہا۔

ہزار ڈیڑھ کی چیزوں کے لئے سو دوکانیں اترنا چڑھنا کوئی شرافت ہے۔ شہر کی ایک ایک دوکان میں گئے ہوں گے۔ میں تو اتنا تنگ ہوگیا دل میں سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ دوپہر کو تو......" حنا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اس کا قہقہہ کمرے کی ہلکی نیلی روشنی میں گم ہوگیا۔

"امی بھی سویرے بتا رہی تھیں کہ میں نے منصور کو زبردستی حنا کے ساتھ بازار بھیجا تھا اور خود آرام سے سوگئی تھی۔"

"میرے بس میں ہوتا تو بھاگ کر واپس آجاتا۔ اتنا بور میں اپنی پوری لائف میں نہیں ہوا ہوں۔"

"اچھا کبھی وائف سے بور ہوئے ہو؟......" حنا نے اتنا کہا اور دونوں ہنس پڑے۔

حنا تھوڑا کھسکی اور منصور کے سینے پر سر رکھ دیا۔ منصور اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگی کرنے لگا۔

"وہاں کیپٹل مارکیٹ میں تو......"

حنا نے منصور کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اسے بولنے نہیں دیا۔

وہ تھوڑی دیر تک منصور کے سینے پر ہاتھ پھیرتی رہی اور پھر بولی۔ "مجھے سب پتہ ہے۔ مجھے تمہاری طبیعت کا بھی پتہ ہے..... لیکن کبھی کسی پر احسان کرتے ہیں تو پھر اس طرح بار بار بور ہونے کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بات اچھی نہیں ہوتی حنا بہت اچھی ہے لیکن اس کو بہت زیادہ بولنے کا مرض لاحق ہے اور پھر...... آخر وہ ہے تو عورت...... کچھ خامیاں اس میں ہوں گی کچھ مجھ میں......"

منصور نے حنا کا چہرہ اوپر کیا اور بے حد پیار سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ حنا نے آنکھیں جھکا لیں اور پیار بھری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آگئی۔ منصور نے جھک کر حنا کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے نکل کر گالوں پر تیر آئی۔

مسکراہٹ روشن مسکراہٹ

غیاث جونیجو

بھکاری

میری طبیعت میں گرانی تھی۔ میں گزشتہ تین دن سے مسلسل رپورٹ کی تیاری میں مصروف تھا اور رپورٹ تھی کہ کسی طور ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ کام کے الجھاؤ سے ایک جھنجلاہٹ میرے اندر در آئی تھی۔ اسی ہفتے کمپنی کے ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہونے والی تھی جس میں اسٹور کے امور سے متعلق بات چیت ہونی تھی۔ اسٹور کے منیجر کی حیثیت سے مجھے دوکان کے پہلے سال کی رپورٹ پیش کرنی تھی۔ جس میں اعداد و شمار دینے ہوتے ہیں کہ پورے سال میں کون کون سی چیزیں دوکان میں آئیں' کیا کیا بیچی گئیں' کتنا نفع ہوا اس تفصیل کو جمع کرنے کے لئے اتنا زیادہ وقت تو درکار نہیں تھا مگر اس چھوٹے سے کام میں تین دن لگ گئے۔

اس کا سب سے بڑا سبب دوکان میں ہروقت کی دھاچوکڑی تھی۔ محفلوں کا میں رسیا ہوں' اس لئے میرے دوستوں کی کمی نہیں ہے۔ دوست بھی دوکان کو میری ذاتی بیٹھک سمجھتے تھے۔ اس لئے دوکان ہر وقت گپ شپ کا مرکز بنی رہتی تھی۔ دوکان میں زیادہ رش نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی گاہک آجاتا تو اسے رمضان نمٹا دیتا تھا۔ میں اپنے دوستوں میں مصروف رہتا' دوست بھی فارغ تھے۔ گھر سے بے فکر' چائے کا بل کبھی میں ادا کرتا کبھی دوست۔ صبح سویرے جو محفل جمتی تو وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ شاید ہی کوئی مسئلہ ہوتا جس پر بحث نہ ہوتی ہو۔ کبھی کبھی بحث میں گرمی آجاتی' تو یوں لگتا جیسے سارے جہاں کے مسائل ان ہی کے لئے ہیں۔

آج صبح سے مجھے مشغول اور منہ پھلائے دیکھا تو دوست الٹے پاؤں واپس چلے گئے اس لئے محفل نہ جم سکی۔ مجھے خود تنہائی چاہیے تھی۔ اس لئے کسی کو بیٹھنے کے لیے اصرار نہیں کیا البتہ تھوڑی دیر پہلے رشید آکر بیٹھا تھا۔

رشید کے لئے چائے کا آرڈر دیا۔ ابھی رجسٹر کی طرف منہ کیا تھا کہ کوئی دروازے کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔ ایک ہٹا کٹا جوان تھا۔ چوڑا سینہ' مضبوط بازو' بھرا ہوا جسم ایک ہاتھ میں ڈنڈا دوسرے میں کشکول۔ بے اختیار میری نظریں اپنے سوکھے سڑے جسم کی طرف جھک گئیں' جس پر انگلی رکھ کر ہڈیاں گنی جا سکتی ہیں۔ خیال آیا شاید بے چارے کی ٹانگیں بے کار ہوں۔ میں نے اس کی ٹانگوں کی طرف دیکھا۔ جو اس کے جسم کی طرح مضبوط تھیں۔ مجھے اپنی طرف گھورتے ہوئے پاکر اس نے اپنی آواز

میں بے چارگی پیدا کرکے آواز نکالی۔

"اللہ کی راہ میں ایک آنہ..... مولا زیادہ دے گا۔"

رمضان نے شوکیس میں رکھے تانبے کے سامان کو جھاڑن سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"معاف کرو بابا۔"

مگر فقیر بھی مالک اور نوکر کے امتیاز کو خوب جانتا ہے۔ رمضان کا جواب سنا' ان سنا کرکے رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"سائیں..... سیٹھ صاحب خدا کے نام پر ایک آنہ..... رب کمائی میں برکت دے گا۔"

میرے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ پتہ نہیں کیوں جب کوئی مجھے سیٹھ صاحب کہتا تو میرے اندر ایک نامعلوم سی تبدیلی آجاتی۔ ایسا لگتا جیسے میں واقعی سیٹھ ہوں..... یہ شاہی دوکان' اس کی سب چیزیں' یہ نوکر چاکر سب میرے ہیں۔ میں ان کا مالک ہوں..... اور پھر تصور ہی تصور میں اپنے کارخانے' اپنے عالیشان بنگلے' اپنی شاندار کاریں اور اپنے آگے دولت کے ڈھیر دیکھنے لگتا ہوں۔ دل ہی دل میں ایک نئی زندگی بسر کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ جس میں خوشی ہو' راحت ہو' بے فکری ہو..... اور کیا کیا نہ ہو اس میں۔

اچانک رشید کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"بھیک مانگتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"

"سائیں شرم تو آتی ہے مگر....."

"تو پھر بھیک مانگنا کوئی اچھی بات ہے کیا؟"

رشید نے بیچ میں اس کی بات کاٹی۔

فقیر نے اپنا کشکول اور ڈنڈا دوکان کی دہلیز کے پاس ٹکایا بازو کھجاتے ہوئے بولا۔

"سائیں بھیک نہیں مانگوں تو کیا کروں؟ پیٹ کم بخت کوئی چھوڑنے والی چیز ہے۔"

فقیر کے ان لفظوں سے میرا دھیان بھی اس کی طرف چلا گیا۔ میں نے اس کو کہا "کیوں کیا کرو؟ جوان ہو مضبوط جسم ہے۔ محنت مزدوری کرو۔ اچھا خاصا مل جائے گا۔"

ساتھ کی دوکان میں برکت پان والے نے شاید ہماری گفتگو سن لی تھی۔ وہیں سے چلا کر کہا۔

"ارے سائیں ایسے ہڈحرام مزدوری کریں گے؟ مزدوری میں سارا دن محنت کرنی پڑتی ہے' تو بھی وہی روپیہ سوا روپیہ ملے گا۔ یہاں تو مزے ہیں۔ آرام سے چکر بھی لگائیں۔ تین چار روپے نکال لیتے ہیں۔ کیسی محنت؟ کیسی تکلیف؟ کیوں استاد؟"

اس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے قہقہہ لگایا۔

رمضان نے بھی شوکیس میں منہ چھپا کر دانت نکال دیئے۔

رشید نے دوبارہ بات شروع کی۔

"برکت ٹھیک کہتا ہے۔ ویسے بھی بھیک مانگنا ان لوگوں کی عادت بن گئی ہے۔ جب تک بھیک مانگ

کر نہیں کھائیں گے۔ اس وقت تک ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔"

فقیر نے پہلے ایک نظر برکت پان والے پر ڈالی پھر رشید کو گھورنے لگا۔ آخر کمزور آواز میں بولا۔

"نوکری کیلئے بہت بھٹکا ہوں سائیں۔ مگر کہیں نہیں ملی۔ سب نے جواب دیا کہ جگہ خالی نہیں ہے۔ آخر مجبوری ہی سب کچھ کراتی ہے سائیں۔"

فقیر کے چہرے پر دکھوں کی لکیریں ظاہر ہونے لگیں۔ میں نے کہا۔

"نوکری نہیں ملی تو نہ سہی کسی کارخانے میں جاکر مزدوری کر لو۔ اتنی ملیں کھل گئی ہیں۔ دوسری خلق خدا بھی تو محنت مزدوری کررہی ہے۔ کوشش سے کیا نہیں ہو سکتا ہے۔"

فقیر نے گمبھیر آوازمیں جواب دیا۔

"اس کے لئے سفارش چاہیے سائیں۔ کارخانے والے ضمانت مانگتے ہیں' میں مسکین آدمی......"

تھوڑی دیر کے بعد اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ ایک دم سے کہا۔

"سائیں آپ ہی اپنے پاس نوکر رکھ لیں۔ سارے دن کے کام کے عوض صرف اتنا دیں کہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال سکوں۔"

یہ سن کر میں گڑبڑا گیا۔

مجھے اس سے ایسے سوال کی توقع نہیں تھی۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ اتنی پھٹکار سن کر وہ چلا جائے گا۔ مگر وہ تو لسوڑے کی طرح چپک گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہے۔ مگر رمضان نے یہ مشکل آسان کر دی۔ شاید اس کو اپنی نوکری جانے کا خدشہ پیدا ہوگیا تھا۔ آنکھیں دکھا کر کہنے لگا۔

"چلو چلو بڑا آیا ہے دوکان پر نوکری کرنے۔ کل دوکان ہی چوری کرکے خالی کر دو پھر؟ بے ضمانت آدمی کو کون رکھے گا۔"

اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے رمضان نے سیٹھ عبد اللہ کی مثال دی۔ جس نے ایک ایسے شخص پر رحم کھا کر نوکری دی تھی۔ تین دن بھی نہیں گزرے کہ وہ موقع پاکر تجوری سے ڈھائی سو روپیہ اڑا کے گم ہوگیا۔ بہت دوڑے بھاگے مگر کچھ نہ ملا۔

"ہاں سائیں' ہاں۔ جس نے آوارہ گردی کرکے کھایا ہو۔ اس کو کہاں بیٹھنا آتا ہے۔"

"جس چیز کی عادت پڑ جائے تو وہ عادت چاہیے ٹانگ ٹوٹنے نہیں جاتی۔ نہیں سنا ہے کیا۔"

اتنی لعنت ملامت کا بھی ظاہرا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ گردن جھکائے خاموش کھڑا رہا اس کا اس طرح کھڑا رہنا اس بات کی علامت تھی کہ اس کو شاید مجھ سے کسی امید افزا جواب کی توقع تھی۔

رشید نے پھر دوسرا مسئلہ چھیڑا۔

"بہتر تو یہ ہے۔ حکومت کو خود اس طرف دھیان دینا چاہیے۔ ایسے لوگوں کو روزگار دینے کے مناسب اقدام کرنے چاہئیں۔ ان کو زبردستی کام پر لگایا جائے اور جو شخص نافرمانی کرے ان کو سخت سے سخت

سزائیں دی جائیں۔"

"سائیں یہ تو ٹھیک ہے' مگر ان لوگوں کی ذہنیت تو حکومت نہیں بدل سکتی۔ یہ لوگ نرمی کو تو جانتے ہی نہیں جو بھی ان کے سر پر ہاتھ رکھے گا' ان کے ہی ہاتھ کاٹیں گے۔ ان سے ایمانداری کی امید رکھنا بے کار ہے۔"

رمضان نے فقیر پر دوسرا وار کیا۔

میں بھی دخل اندازی کرنے سے باز نہیں رہ سکا۔

"خیر اس کے بھی بہت علاج ہیں۔ اگر ملازمت دیتے ہوئے نقد ضمانت لے لی جائے تو ملازم جرم کرتے ہوئے ڈرے گا اور کام میں بھی دلچسپی لے گا۔ اس کے علاوہ پیسہ بھی ضائع نہیں ہوگا۔ کسی بھی وقت نوکری چھوڑے تو اسے ضمانت کی رقم واپس مل سکے گی۔ اس میں کیا حرج ہے۔"

رشید نے کہا۔

"حرج تو کوئی نہیں ہے' مگر تم جو ابھی یہ حساب کتاب کر رہے ہو' تو یہ ایسے بھی ممکن ہے کہ کمپنی یہ دوکان ہی بند کرنے کا فیصلہ کر دے' پھر تم بھی بے روزگار ہو جاؤ گے۔ اول تو مسئلہ ہے نوکری ملنے کا اور اگر مل بھی جائے تو ضمانت کے چکر کیسے پورا ہوگا۔"

"ارے سائیں پھر تو بات ہی ختم۔"

رمضان کی چیخ نکل گئی۔

"اگر یہ دوکان بند ہوگئی تو پھر میں کہاں جاؤں گا۔ منیجر صاحب کو تو کوئی نہ کوئی نوکری مل جائے گی اور ضمانت بھی مل جائے گی' مگر میرے جیسوں کا حال تو سچ مچ اس فقیر کی طرح ہے......."

اس نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا تو فقیر غائب تھا اور رمضان نے خود کو فقیر کی جگہ کھڑے پایا اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔

مراد علی مرزا

خوبصورتی اور دیوانگی

ٹرر........ ٹرر.......... ٹرر...............

اچانک ٹیلفون کی گھنٹی بجی۔ اس نے جھپٹ کر ریسور اٹھا۔

"جی؟"

"جی!"

"ہوں"

"ہوں"

آج تم نے بہت انتظار کرایا۔ میں کتنی دیر سے تمہاری میٹھی سی آواز سننے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔

"میٹھی سی آواز! ہوں۔"

"ہاں میٹھی سی آواز' نرم نرم میٹھی سی آواز! ہوں۔"

"میٹھی آواز کیا ہوتی ہے؟ میں نے تو اس پر کبھی غور بھی نہیں کیا ہے۔ آج تم نے احساس دلایا ہے' اس لئے آئندہ ضرور خیال رکھوں گی کہ آواز میٹھی ہے یا کڑوی۔"

"میں نے میٹھی نہیں کہا بلکہ میٹھی سی کہا ہے۔ تمہاری آواز میٹھی سی ہے۔ تم میرے لفظوں پر غور کرو.......... تمہاری آواز میٹھی سی ہے۔ ایسی میٹھی سی جس کو سننے سے میرے ذہن میں کسی پہاڑی جھرنے کا خیال ابھر آتا ہے۔ جس کو سننے کے بعد آنکھوں کے آگے سرسبز اور شاداب کھیتوں کا نظارہ ابھر آتا ہے۔ سمجھ گئیں نا؟"

"اپنی تمہاری آواز سننے اور نہ سننے کے فرق کو اب سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"ہوں! یہ تمہارا اپنا خیال ہے.......... خیال جو صرف خیال ہی ہوتا ہے اور نہ حقیقت' لیکن میں سمجھ رہی ہوں کہ تم مجھے بتانا چاہ رہے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ میں اپنی خوبیوں کی پہچان تمہارے لفظوں کے وسیلے حاصل کروں اور پھر میں تمہاری باتوں پر اعتبار کرنا بھی شروع کر دوں۔ کیوں سچ کہہ رہی ہونا؟"

"تم سدا سچ ہی بولتی ہو۔ میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا ہے۔"

"سچ (قہقہے) سچ کہاں ہے؟ (ٹھنڈی سانس) سچ تو اب لفظوں کے لباس میں چھپ گیا ہے۔ تم بھی تو

صرف لفظ ہی استعمال کر رہے ہو۔"

"لفظ ہی تو اظہار کا وسیلہ ہیں۔ اگر لفظ نہ ہوں تو اظہار کس طرح کر سکیں گے۔ احساس اور امنگ جب لفظوں کے قالب میں ڈھل کر آتے ہیں تب پھر ان سے کوئی معنے 'کوئی مطلب ظاہر ہوتا ہے۔"

"ہوں۔ احساس کے اظہار کے دوسرے بھی کئی وسیلے ہوتے ہیں۔" مثلاً آواز' رنگ' جسمانی حرکت وغیرہ وغیرہ۔"

"لیکن لفظوں کا اثر ہی نرالا ہوتا ہے۔ ان میں زور ہوتا ہے۔ قوت ہوتی ہے۔ جادو ہوتا ہے۔"

"اور تم اس آخری وسیلے سے کام لینا چاہتے ہو۔ یعنی لفظ جس میں تمہارے کہنے کے مطابق جادو ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تم میرے اوپر جادو کرنا چاہتے ہو۔" (قہقہے)

"مجھے جادو پر بالکل یقین نہیں ہے۔ مجھے تو لفظوں پر اعتبار ہے۔ میرے لفظ کبھی بھی جھوٹے نہیں ہوسکتے۔ ان میں میرے احساسات اور امنگوں کا عکس ہو گا۔ ان میں سچ سمایا ہوگا۔ میں فنکار ہوں اور فنکار سچ کے ساتھی ہوتے ہیں۔ سچ جو ایک خوبصورتی ہے اور خوبصورتی جس کی تلاش میں ہر فنکار بھٹکتا رہتا ہے۔ اگر تمہارے کہنے کے مطابق سچ کہیں نہیں ہے تو پھر یقین جانو کہ خوبصورتی بھی کہیں نہیں ہے۔"

"خوبصورتی (قہقہے) خوبصورتی کیا ہوتی ہے بھلا؟"

"خوبصورتی سچ کا دوسرا نام ہے۔ سنو لفظوں کے کئی روپ ہوتے ہیں۔ ظاہری اور باطنی۔"

"مردوں کی طرح؟"

"ہوں۔ عورتوں کی طرح!"

"عورت کا فقط ایک روپ ہوتا ہے۔ (ٹھنڈی سانس) تم نے اس پر کبھی غور کیا ہے؟"

"میرا سارا وقت اسی سوال پر غور کرتے گزرتا ہے۔"

"تو پھر تم کس نتیجے پر پہنچے ہو۔"

"میں۔۔۔ (ٹھنڈی سانس) میں کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچا ہوں۔ سنو میں ایک فنکار ہوں۔ سچ کا ساتھی اور خوبصورتی کا دیوانہ لیکن یاد رکھنا کہ جس وقت بھی اور جب بھی خوبصورتی کی دیوانگی ختم ہو گی تو پھر میرے اندر بیٹھا ہوا فنکار مر جائے گا۔ مجھے اپنے مقدر کا علم ہے۔ میں اپنے اندر کے فنکار کو مارنا نہیں چاہتا میں یا شاید مجھ میں بیٹھا فنکار یہ چاہتا ہے کہ وہ دیوانگی سدا سلامت رہے۔"

"دیوانگی؟ اس لئے تو تم کو میری آواز میں مٹھاس محسوس ہوتی ہے۔ ایسی مٹھاس جو سچ مچ میری آواز میں موجود ہی نہیں ہے۔"

"ایسے نہ کہو۔ تمہارے حواس تمہاری اپنی آواز کی مٹھاس محسوس نہیں کر سکیں گے۔ تم اسی مٹھاس سے' جس کو خوبصورتی بھی کہہ سکتے ہیں' کیونکہ خوبصورتی بہت سی صفات کا بھی نام ہے' واقف نہیں ہو۔"

"(قہقہہ) پھر یہ کہنا چاہیے کہ تم نے خوبصورتی کو ڈھونڈ لیا ہے اور اس طرح تم میں بسا ہوا فنکار تو مر جائے گا!"

"نہیں' میں نے خوبصورتی کو ابھی نہیں ڈھونڈا ہے۔ میں نے ابھی صرف خوبصورتی کے ایک ذرے' ایک حصے اور جز کو محسوس کیا ہے۔ (ٹھنڈی سانس) کاش میں سراپا خوبصورتی کو پا سکتا۔ میں تو صرف اس کا احساس کر سکتا ہوں۔ ان ذروں' جز اور حصوں کو تراش کر' ملا کر میں اپنے ذہن کے پردے پر کوئی نقش قائم کر سکتا ہوں۔ تم کو کچھ معلوم ہے میرے ذہن میں تمہارا کیا نقشہ ہے؟ تم میرے ذہن کے آئینے میں کس طرح اور کیسی نظر آتی ہو؟"

"ہوں۔ مجھے ابھی تک تو ایسا کوئی احساس ہی نہیں ہوا ہے۔"

"دوسرے لفظوں میں تم جان بوجھ کر کچھ بھی محسوس نہیں کرنا چاہتی ہو' جبکہ آپ عورتیں اشاروں پر بہت زیادہ یقین رکھتی ہو۔"

"بے شک اشارے معنی کے سمندر ہوتے ہیں۔ ہاں بشرطیکہ کوئی غواص ان پانیوں میں جا کر معنی کے موتی جمع کر کے آئے۔"

"تم نے کتنی معنی خیز اور کتنی گہری بات کی ہے' لیکن یہ کام تو صرف فنکاروں کے بس کی بات ہے۔ کیا تم بھی فنکار ہو؟"

"فنکار صرف مرد نہیں ہوتے۔ فن کا تعلق دل اور دماغ سے ہوتا ہے اور کوئی عورت بھی ان چیزوں سے خالی نہیں ہوتی۔"

"نہیں اس کا واسطہ احساسات اور امنگوں سے ہوتا ہے اور اس عقل مندی سے جو صرف قدرتی ہوتی ہے۔"

"شعور اور ذہانت صرف مردوں کا ورثہ نہیں ہیں۔" (قہقہے)

"ہوں! میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے۔" (ٹھنڈی سانس)----- (ٹھنڈی سانس)

"ہم ایک دوسرے سے کتنی دور ہیں۔"

"ہاں ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت زیادہ دور ہیں' اتنی دور' اتنی دور کہ اس فاصلے کو ناپا بھی نہیں جا سکتا۔"

"لیکن فاصلے کی کوئی بھی اہمیت نہیں ہوتی' فاصلے تو فریب کی علامت ہوتے ہیں۔ نظر کے فاصلے' فکر کے فاصلے' وقت کے فاصلے' دلوں کے فاصلے' سب ہی فریب' سب ہی دھوکہ ہوتے ہیں۔ اگر فاصلے ہوتے تو ایسے کیسے ممکن تھا کہ میں اسکی آنکھوں میں ڈوبتا۔ ہرنی جیسی بڑی بڑی اور آبدار آنکھیں۔ میں اس کی آنکھوں کو اتنے قریب سے دیکھ سکتا ہوں کہ ان کی روشنی اور ٹھنڈک میری روح میں سما گئی ہے............"

(قہقہے) "میری آنکھوں میں اتنا اندھیرا تو نہیں ہے۔"

(قہقہے) "تم کو ان میں تاروں کی جھرمر اور رات کی ٹھنڈک کس طرح محسوس ہوئی؟"

(ٹھنڈی سانس) "میں خیالوں کے بہاؤ میں پتہ نہیں کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا........ تم نے ایسی بات کی تھی کہ میں حال کی سرحدیں پھلانگ کر ماضی کے کھنڈرات میں پہنچ گیا تھا۔ تم نے آج پھر مجھے انہیں

کھنڈروں میں پہنچا دیا ہے' جہاں پر یادیں سانپ بن کر میری روح کو ڈستی ہیں۔"

(ٹھنڈی سانس) "آپ جیسے فنکاروں کا یہی مقدر ہے۔"

"ہاں ہمارا یہی مقدر ہے' لیکن ہم سب کچھ جانتے ہوئے بھی حقیقت سے فرار حاصل کرتے ہیں کہ کہیں تخلیق کا دیا بجھ نہ جائے۔"

(خاموشی) ....

"ہیلو.......... ہیلو!"

"جی۔"

"سن رہی ہو نا۔"

"ہاں ہاں سن رہی ہوں۔"

"میں سمجھا کہ شاید ٹیلی فون کٹ گیا---۔ (خاموشی) شاید ہمارے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے' کیونکہ تم بالکل خاموش ہو گئی ہو---۔ اچھا تم کو اپنا ماضی یاد ہے؟"

"کیا کہا؟ ماضی! (ٹھنڈی سانس) ہم عورتیں ماضی کو یاد نہیں رکھتیں ہیں۔ ہم ہمیشہ مستقبل کی امیدوں اور آسروں پر زندہ رہتی ہیں۔"

"مستقبل کی امیدیں اور سہارے؟ کتنا خوش کن خیال ہے! لیکن ہم مرد ماضی کے پجاری ہوتے ہیں۔ ہم فنکار ماضی کے بجھتے ہوئے دیوؤں سے خیالی شمعیں روشن کرکے مستقبل کی اندھیری راہوں کو تلاش کرتے ہیں۔ ہمارے فکر اور فن کا سرمایہ ماضی کی مجروح داستان ہوتی ہے' جن کے عذابوں کے الم اپنے کندھوں پر اٹھائے حال کے میدانوں میں آکر گاڑتے ہیں اور یہی ہمارے فکر اور فن کی علامت ہوتے ہیں۔"

"میں نے سمجھا کہ آج تم مجھے اپنا فلسفہ سمجھانے کے موڈ میں ہو۔"

"نہیں' آج میں بہت اداس ہوں۔ اتنا اداس ہوں' اتنا اداس ہوں کہ اس اتنی بڑی کائنات میں مجھے میرا کوئی نظر نہیں آرہا' کوئی نہیں ہے۔ جو مجھے اس منحوس اداسی سے نجات دلا سکے۔"

"ہم سب اداس ہیں (ٹھنڈی سانس) کون ہے جو خوش رہتا ہے؟ لیکن تم کو تو اداس اور مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ تم تو فنکار ہو۔ مایوسیوں اور تاریکیوں سے آپ کا کیا واسطہ ؟"

"ہمارا ان سے ازل سے رشتہ ہے۔ ہم مایوسیوں اور تاریکیوں کے مسافر ہیں۔ ہم کو تو ازل سے صبح کی روشنی کی تلاش رہتی ہے' جس کی تلاش میں ہم ہمیشہ بھٹکتے رہتے ہیں........ تنہا تنہا........ اکیلے اکیلے۔"

(ٹھنڈی سانس) "کاش میں تمہیں کوئی خوشی دے سکتی۔"

"ساری عورتیں اسی طرح کہتی ہیں۔ (ٹھنڈی سانس).......... اس نے بھی مجھے یہی کہا تھا!"

"کون؟......... کون تھی وہ؟"

"وہی' جس نے کبھی مجھے اپنا کہا تھا۔ جس کی نرم نرم انگلیاں میں اب بھی اپنے پریشان بالوں میں سہلاتے ہوئے محسوس کرتا ہوں۔ جس کے پھول جیسے گلابی گالوں سے میرے بےقرار اور بے چین ہونٹوں نے

رس چوسا تھا۔ جس کے گھنے اور گھٹاؤں جیسے بالوں کی ٹھنڈی اور خوشبودار چھاؤں میں لیٹ کر میں نے آرام کیا تھا۔ جس کی محبت کی شراب سے میں اب تک خمار میں ہوں۔"

خاموشی.........

"کیوں' تم خاموش ہو گئیں' تم نے پوچھا تھا کہ وہ کون تھی؟"

"ہاں میں نے وہی پوچھا تھا۔ لیکن...... لیکن........"

ہاں ہاں' کہو' تم پھر کیوں خاموش ہو گئی ہو؟ بتاؤ' بتاؤ تم کیا کہنا چاہ رہی تھیں؟"

کچھ بھی نہیں' کچھ بھی نہیں' کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔ میں تو ایک عورت ذات ہوں اور ہمارے یہاں عورتیں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی ہیں۔"

"نہیں کہنے کے باوجود تم نے بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ تمہارے اندر یہی تو خوبیاں ہیں۔ اس میں بھی یہی خوبیاں تھیں جس نے میرا دل جکڑ لیا تھا' (ٹھنڈی سانس) وہ بہت اچھی تھی۔ بالکل تمہاری طرح........ وہی لہجہ' وہی آواز نرم نرم اور میٹھی میٹھی سی۔"

"مجھے کیا پتہ؟"

"ہاں تمہیں بھلا کیسے پتہ ہو گا۔ مجھ پر تو وہ کیفیت گزری ہے۔ میں بہت کوشش کے باوجود بھی اسے نہیں بھلا سکا ہوں۔ وہ میری ویران زندگی میں بہار کے جھونکے کی طرح آئی اور چلی گئی' لیکن میرا ذہن اب بھی اس کے گلابی جسم کی خوشبو سے مہک رہا ہے۔"

"مجھے تم سے پوری پوری ہمدردی ہے۔"

"وہ چلی گئی مجھے مایوسیوں کے ویرانوں اور بیابانوں میں اکیلا چھوڑ کر' وہ چلی گئی۔ میں زندگی کے بگولوں میں جکڑ گیا اور جب بگولوں سے آزاد ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ اس کی شادی ہو گئی....... لیکن مجھے یقین نہیں آتا۔ وہ کبھی اس طرح سے نہیں کر سکتی تھی۔"

"کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ (ٹھنڈی سانس) عورتوں کا یہی مقدر ہوتا ہے۔"

"تم سے ایک بات پوچھوں؟"

"ہوں۔"

"تمہیں یاد ہے کہ ایک دن اچانک ٹیلیفون پر ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ میں اپنے ایک دوست سے بات کرنا چاہ رہا تھا اور اس کے بجائے میں نے ہیلو کیا اور تمہاری آواز سنی۔"

"اس میں میرا کیا قصور ہے۔ تم نے اپنا تعارف کرایا تھا۔ میں چپ ہو گئی۔ دراصل میں فنکاروں کی عزت کرتی ہوں۔"

"ہاں میں نے ہی اپنا تعارف کرایا تھا' لیکن.......... لیکن تم نے مجھے آج تک اپنا نام بھی نہیں بتایا۔"

"نام میں کیا رکھا ہے؟ میرا نام سنکر تم کیا کرو گے؟ (ٹھنڈی سانس) میرا کوئی بھی نام نہیں ہے۔ کبھی

میرا بھی کوئی نام تھا۔ ویسا ہی جیسا کہ عام طور پر عورتوں کا ہوتا ہے۔"

"شاید میں بھول گیا ہوں' یا شاید اس کی محبت کے خمار میں' میں! آوازوں کے درمیان فرق محسوس نہیں کر سکتا ہوں۔ لیکن یقین کرو......... اس کی آواز تمہاری آواز جیسی تھی!"

"کیا مطلب؟"

"میں نے کہا......... اس کی ہوبہو تمہارے جیسی آواز تھی۔ میٹھی میٹھی سی' دھیمی دھیمی سی وہ جب میرے قریب بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرتی تھی تو یوں محسوس ہوتا تھا........."

"کیا محسوس ہوتا تھا۔"

"اس کی باتوں سے گلاب کی خوشبو اور موتیئے کی مہک محسوس ہوتی تھی۔"

"ہوں۔"

"اور تمہاری باتوں سے بھی گلاب کی خوشبو اور موتیئے کی مہک محسوس ہوتی ہے۔"

"تم شاعری کر رہے ہو۔ جسکا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔"

"اس نے بھی یہی کہا تھا' ہاں نسرین نے بھی یہی کہا تھا۔"

"نسرین!"

"کیوں تم چونک کیوں گئیں........ سمجھ گیا تم ہی وہ نسرین ہو........."

.... (خاموشی)

"تم جواب کیوں نہیں دے رہی ہو؟"

.... (خاموشی)

"جواب دو نا! مجھے زیادہ پریشان مت کرو۔ میں یہ خاموشی برداشت نہیں کر سکتا ہوں۔ تمہاری یہ خاموشی میری روح کو کھائے جا رہی ہے۔ بتاؤ نا۔۔۔۔۔ نسرین!"

"میرا نام نسرین.......... نہیں ہے۔"

"تمہارا نام نسرین نہیں ہے! (خاموشی) تو پھر تم وہ نسرین نہیں ہو۔ تم شاید وہ نہیں ہو' جو میرے سینے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کرلیتی تھی۔ جس کی باتوں میں بہاروں کی خوشبو اور جھرنوں جیسی رونق تھی۔ میں نے جس کی آنکھوں میں صبح کی ٹھنڈک دیکھی اور اس کے بوئے جیسے سنہری جسم کی چھاؤں کو آج بھی محسوس کرتا ہوں......... البیلی اور چنچل نسرین جس کی گود میں سر رکھ کر میں نے اپنی روح کو تلاش کر لیا تھا.........."

(سسکیاں)

"میں سمجھا کہ تم وہی نسرین ہو......... میری کھوئی ہوئی جنت جس کی تلاش میں میں اب تک بھٹک رہا ہوں۔"

نظر آئی تھی............"

(سسکیاں)

یہ کیا تم رو رہی ہو؟ میں اپنے خیالوں میں گم پتہ نہیں کیا کیا کہہ گیا ہوں۔ مجھے افسوس ہے.......... لیکن میں تو نسرین کی بات کر رہا تھا۔ تم کہہ رہی ہو کہ تم نسرین نہیں ہو......... تم وہ نہیں ہو۔ جس کے ریشمی جسم کی روشن خوشبو سے اب تک میرا بدن مہک رہا ہے۔ تمہیں پتہ ہے کہ اس نے میرے کندھے پر اپنا سر رکھ کر مجھے کیا کہا تھا؟"

.... (سسکیاں)

"اس نے کہا تھا کہ میں تم سے کبھی بھی جدا نہیں ہوں گی اور پھر.......... ماضی' حال اور مستقبل کے سب رشتے' فاصلے' حدیں ختم ہو گئیں تھیں..........."

"نہیں' نہیں' نہیں' میں نسرین نہیں ہوں۔ میں نسرین نہیں ہوں' سمجھ لو نسرین مر گئی'وہ مر گئی اور اب تم اسکو کبھی بھی نہیں دیکھ سکو گے۔"

(چونک کر) "ہیلو.......... ہیلو....... تم نے ٹیلیفون بند کیوں کر دیا؟....... نسرین!......... نسرین!........"

اس نے آہستہ آہستہ ٹیلی فون کا ریسور رکھ دیا اور برابر والی کھڑکی سے دور افق میں گھورنے لگا جہاں دن کی روشنی کو رات کی تاریکی جکڑتی جا رہی تھی۔

نورالہدیٰ شاہ

گورکن

ڈھلتی شام کے سائے آہستہ آہستہ بکھرتے جارہے تھے۔ رات پر پھیلائے دھرتی کے سینے پر اترنے کے لئے بے قرار تھی۔ وہ ہوا کی سسکیوں' پتوں کی سرسراہٹ' قبروں سے ابھرتی ایک پراسرار خاموشی اور ویرانی کے درمیان نیم کے پیڑ کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا' یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی تقدیر کی ساری خوش بختیوں کو ابھی ابھی دفن کرکے تھک ہار کر بیٹھا ہے۔ اندھیرے نے پر پھیلائے تو نیم کے پتوں سے چھن کر آنے والی چاند کی روشنی کا ہالہ اس کے گرد پھیل گیا۔ موت جیسی سنسان رات کو چاند کے ہالے میں اس کا ٹوٹا پھوٹا وجود پراسرار لگ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی کدال پڑی تھی جو اس کی طرح اداس اور تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔ (کم از کم اس نے تو ایسا ہی محسوس کیا تھا)

اس قبرستان میں وہ اس وقت سے گورکن تھا جب اس کی مسیں ابھی بھیگی تھیں اور آج اس کے سر اور داڑھی کے آدھے بال سفید ہو چکے تھے۔ دھرتی کی چھاتی پر زندگی سے بچھڑنے والے انسان کو دفنا کر' پیٹ بھرنے کا یہ دھندا اسے ورثے میں ملا تھا۔ اس کا باپ' دادا اور شاید اس کا پردادا بھی یہی کام کرتے چلے آئے تھے۔ موت' زندگی' قبریں' ویرانیاں ہی دنیا سے بچھڑے ہوئے اس اکیلے انسان کی زندگی کا سارا تھیں۔

اور اب دو دن گزر گئے تھے۔ اس کے گھر چولہا نہیں جلا تھا۔ بھوک موت کی طرح اسے پکڑنے کے لئے آگے بڑھ رہی تھی۔ ان دو دنوں میں وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح گھر لوٹتا تھا۔ ان دو دنوں سے اس کی کدال بھی اداس تھی۔ اس کے بچوں کی آنکھوں میں بھوک کے سائے تھے۔ اس کی بیوی کے چہرے پر دکھوں کی پرچھائیوں کا ہجوم اور گہرا ہو گیا تھا۔ ان دو دنوں سے موت نہیں جاگی تھی۔ اس شہر میں کسی کی زندگی کا تار نہیں ٹوٹا تھا۔ وہ مسلسل سوچ رہا تھا کہ جہاں روزانہ بے شمار لوگ زندگی سے رشتے توڑ دیتے ہیں وہاں دو دن سے سب زندہ ہیں۔ اس شہر میں کوئی دوسرا قبرستان بھی تو نہیں ہے پھر لوگوں کو کیا ہو گیا۔ انہوں نے مرنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ دو دن سے جب وہ خالی ہاتھ گھر واپس آتا تھا تو اس کے بچوں کے چہرے اس کو دیکھ کر تیل سے محروم دیئے کی طرح بجھ جاتے تھے۔ رات کو تو اس کا چھوٹا بیٹا بھوک سے آدھی رات تک روتا رہا تھا اور اس کو چپ کراتے کراتے اس کی بیوی بھی سسکنے لگی تھی۔

سوچوں نے اسے نڈھال کر دیا۔ اس نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اس سارے قبرستان پر نظر دوڑائی اور گردن کو جھٹکا دے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کدال کندھے پر رکھی اور لڑکھڑاتے قدموں سے قبرستان سے باہر نکل آیا۔

باہر آکر اس نے ایک بار پھر گردن گھما کر پیچھے دور دور تک پھیلی قبروں کو دیکھا۔ اسے لگا جیسے بہت سارے مردے قبروں سے نکل کر سفید کفن میں ملبوس موت کا رقص کر رہے ہوں۔ قہقہے لگا رہے ہوں۔ گھبرا کر تیز تیز قدم اٹھاتا گھر کی طرف چل پڑا۔ ابھی وہ آدھے راستے میں تھا کہ معاً" اسے خیال آیا کہ وہ قبرستان کی طرف واپس چلا جائے۔ کیا پتہ آج رات کسی کی زندگی کا چراغ بجھ ہی جائے پھر خیال آیا کہ اگر ایسا ہوا تو ہمیشہ کی طرح لوگ اسے گھر سے بلا لیں گے تب وہ ہانپتا کانپتا دروازے سے ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر گھر کے آنگن میں داخل ہوا۔ لالٹین کی ملگجی روشنی میں اس کی بیوی کسی نٹ جانے والی کنواری لڑکی کی طرح گردن جھکائے چپ بیٹھی تھی۔ سامنے اس کا چھوٹا بیٹا سویا ہوا تھا۔ اس کے گالوں پر پھیلے آنسوؤں کے نشان ملگجی روشنی میں بھی صاف دیکھ لئے تھے۔ اس کو اپنے اندر کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ زمین پر اس کے دونوں بیٹے بلور سے کھیل رہے تھے یا اپنے آپ کو بہلا رہے تھے۔ اس کو دیکھ کر وہ ایسے چونک پڑے جیسے برسوں سے اس کا انتظار کر رہے ہوں' مگر......... باپ کے چہرے پر پھیلے دکھوں کا عذاب دیکھ کر ان کے چہروں پر بھی مایوسی پھیل گئی۔ وہ گردن جھکا کر ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کی بیوی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "چھوٹا روٹی کے بغیر رو رو کر ابھی سویا ہے۔" اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"بابا مجھے بھی بہت بھوک لگی ہے۔" اس کے منجھلے بیٹے کی بھرائی آواز ابھری۔

"بابا آج بھی کوئی نہیں مرا۔" مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ہونٹ جیسے کسی نے سی دیئے تھے۔

"بابا جب کوئی مرے گا تب روٹی پکے گی۔"

"ہاں" جواب دیتے ہوئے اسے اپنی آواز پاتال سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی' پھر اس کے بیٹے نے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھا آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اللہ سائیں تم کسی کو مار دو' تاکہ ہمارے گھر روٹی پکے' او اللہ سائیں" تب اس کے اندر دور کہیں سے "آمین" کی صدا بلند ہوئی۔ وہ خود بھی گزشتہ دو دن سے یہی دعا مانگ رہا تھا۔ کوئی اچانک مر جائے۔ کاش۔ اے کاش.........

اس کے دونوں بڑے بچے اس آس پر کہ شاید کل کوئی مر جائے۔ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے حالانکہ بھوک کی وجہ سے نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ اور اس کی بیوی سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی بیوی کی آواز بہت دیر کے بعد اچانک ابھری۔

"تم کوئی دوسرا کام کیوں نہیں کرتے۔"

"کون سا کام کروں۔ مجھے کون سا دوسرا کام آتا ہے۔ میں تو کوئی کام کرنا جانتا ہی نہیں ہوں۔"

اس کی آواز میں کائنات کی ساری مایوسیاں تھیں۔

"تم کب تک یہ کام کرتے رہو گے اگر آج کوئی مرے گا تو کل کوئی نہیں مرے گا۔ اب گندم اور آٹے کی طرح موت بھی بہت مہنگی ہو گئی ہے۔ کم بخت ڈاکٹر پیدا ہو گئے ہیں۔ کسی کو مرنے ہی نہیں دیتے۔"

اس کی بیوی کو زندہ انسانوں سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

"بختاور انسان کے نصیب میں جب موت آئے گی تب ہی وہ مرتا ہے۔ جب بھی کوئی مرے گا' اپنے وقت پر مرے گا تب تمہارے گھر میں روٹی پکے گی۔"

وہ اپنی بیوی کو سمجھانے لگا۔ حالانکہ وہ اندر سے ریت کے گھروندے کی طرح بکھر رہا تھا۔

"میں نے تو بادشاہ پیر کی منت مانی کہ جب کوئی مرے گا تو بانٹوں گی۔ دو دن سے میرے بچے بھوکے ہیں۔ آخر کب تک بھوکے رہیں گے۔" یہ کہہ کر اس کی ویران آنکھیں بھر آئیں۔ وہ اپنے پھٹے ہوئے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھنے لگی۔ بیوی کو روتا دیکھ کر اس نے لالٹین بجھا دی۔ کہیں اس کی بیوی اس کے آنسو نہ دیکھ لے' جو اس کی داڑھی بھگو رہے تھے۔ لالٹین بجھا کر وہ آدھی رات تک روتا رہا۔ اس خیال سے کہ اس کے بچے دو دن سے بھوکے ہیں۔ اس کی آنکھیں دروازے کو دیکھتیں رہیں۔ کسی آواز کا انتظار کرتی رہیں مگر ساری رات کوئی آواز نہ آئی! ساری رات گلی میں کتے بھونکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ اسے پتہ تھا کہ اس کی بیوی بھی ساری رات روتی رہی ہے اور اس کی بیوی کو بھی پتہ ہے کہ ساری رات وہ آنسو بہاتا رہا ہے۔ کتنی بار اس کی بیوی کے آنسوؤں نے اس کے بازو کو بھگو دیا اور اس کے آنسو کتنی دفعہ بیوی کے چہرے پر گرے مگر وہ دونوں ایک دوسرے سے چھپاتے رہے۔

دوسرے دن سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ کدال کندھے پر رکھ کر قبرستان چلا گیا۔ سارے راستے اس کے کان رونے کی آواز کا انتظار کرتے رہے مگر چاروں طرف زندگی اپنے خوبصورت پر پھیلائے بیٹھی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اگر آج کوئی جنازہ نہیں آیا تو وہ چوری کرے گا مگر خالی ہاتھ نہیں جائے گا۔ قبرستان میں سارا دن اس کی آنکھیں جنازے کا انتظار کرتی رہیں۔ لوگ آتے قبروں پر فاتحہ پڑھتے اور چلے جاتے۔ کوئی پھول چڑھاتا تو کوئی قبروں پر سر رکھ کر سسک سسک کر چلا جاتا۔ وہ روزانہ یہی سب کچھ دیکھتا چلا آیا تھا۔ اس کے لئے یہ سب باتیں پرانی اور بے معنی تھیں کیونکہ ان میں اس کے بچوں کے لئے زندگی کا کوئی پیغام نہ تھا۔

گزرے کل کی طرح آج کا سورج بھی اس کی خوشیوں کی طرح چپ چاپ گزر گیا۔ اس نے سوچا پتہ نہیں کل سورج نکلے گا بھی یا نہیں۔ گزرے ہوئے دن کا ایک واقعہ اچانک اسے یاد آیا اور تیر کی طرح اس کے دل میں اتر گیا ایک نوجوان نے ایک قبر کے پاس کھڑے ہو کر کہا تھا۔

"اے موت' کاش تجھ کو بھی موت آجائے۔"

تب موت کے لئے یہ بددعا سن کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اور آج گھڑی گھڑی اس کے کانوں میں یہی الفاظ گونج رہے تھے۔ اس کے اندر ایک شک نے سر ابھارا کہیں سچ مچ تو اس کی دعا قبول نہیں ہو گئی؟ اس شہر میں جب روزانہ کوئی مرتا تھا تو اس کا گھر زندہ ہوتا تھا' آج سارا شہر زندہ تھا اور اس کا گھر مر رہا تھا۔

"اے زندگی! کاش تجھ کو موت آجائے۔" اس کے اندر زہر سا بھر گیا۔ رات کے پھیلتے اندھیرے میں وہ اپنی ہی سوچوں سے گھبرا گیا تھا۔ آج تیسرا دن تھا۔ اس کے بچے بھوکے تھے۔ اس خیال سے اس کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ کس منہ سے ان کے سامنے جائے گا' کیسے ان کی اداس آنکھیں دیکھ سکے گا۔ کس طرح ان

کے سوالوں کا جواب دے سکے گا۔ کس طرح بیوی کے چہرے پر پھیلا قبرستان دیکھ سکے گا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اندر ہی اندر جلتا اور بجھتا رہا۔ رات کے بارہ بج گئے تھے۔ وہ قبرستان میں ہی بیٹھا رہا مگر کوئی نہیں آیا۔ آخر کار وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ کدال کندھے پر رکھے اپنے گھر کی طرف جانے والے راستے پر ہو لیا۔ راستے میں وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ کل وہ کوئی دوسرا کام تلاش کرے گا۔ کل اگر وہ مزدور نہ بن سکا تو چور بن جائے گا۔ دوسرے دن کے لئے وہ مختلف ترکیبیں سوچتا اور رد کرتا رہا۔ وہ اندر ہی اندر اجڑتا رہا۔ زندگی اس کے لئے کائنات کا سب سے بڑا المیہ بن گئی تھی۔ وہ من ہی من میں اس المیہ پر ماتم کرتا جارہا تھا۔ گلیوں میں رات کے گھور اندھیرے پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے اندر باہر اندھیرے تھے اچانک اسے کچھ فاصلے پر ایک سایہ آگے جاتا ہوا محسوس ہوا تھا" بجلی کی طرح ایک خیال اس کے ذہن کے سنسان ایوانوں میں ابھرا۔ اگر وہ کدال کے ایک ہی وار سے اس سائے کو ختم کر دے تو...... اس کے بعد کی سوچ کتنی خوبصورت تھی۔ اس نے اپنے خیالوں میں بیوی کو چولھے روٹیاں پکاتے دیکھا اور وہ مسکرا بھی رہی تھی۔ اس کے تینوں بیٹے ماں کے قریب بیٹھے روٹی کھا رہے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ شرارتیں کر رہے تھے۔ وہ مسکرا دیا مگر اس سائے کو ختم کرنے کا تصور بہت خوفناک تھا۔ اس نے تو کبھی چوری بھی نہیں کی تھی قتل کیسے کر سکتا تھا۔ دوسرے لمحے اس کے کانوں میں اس کے بچوں کی صدائیں گونجنے لگیں۔ اس کے قدم تیز ہو گئے۔ گلی میں گھور اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں تیز تیز قدم اٹھاتا سائے کے پیچھے چلنے لگا۔

اس کی سانس پھول گئی۔ اس کا دل طوفان میں پھنسے ہوئے جہاز کی طرح کانپنے لگا۔ اس کے ہاتھ کدال پر اس طرح جم گئے جیسے کبھی جدا نہیں ہوں گے اور وہ پھر سائے کے قریب آپہنچا اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کدال اٹھا کر وار کر دیا۔ ایک کراہ چاروں طرف ابھری اور ڈوب گئی (جیسے کچھ بھی نہیں ہوا ہو) یہ کراہ شاید کسی بچے کی تھی مگر اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ جھک کر دیکھتا۔ بس ایک پل کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے بچوں کے چہرے گھوم گئے۔ پورا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ وہ الٹے قدموں قبرستان کی طرف دوڑنے لگا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا' جیسے یہ لمحہ اس کی زندگی کا آخری لمحہ ہو۔ پہلی بار اسے موت سے ڈر محسوس ہوا۔ موت...... جو کسی بد روح کی طرح اپنے کالے بال پھیلائے' میلے دانت نکالے قہقہے لگاتی اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہی ہو۔ اس کی رگوں میں دوڑتا خون جم سا گیا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے سانس کی ڈوری ابھی ٹوٹ جائے گی۔ وہ قبرستان کے گیٹ کے قریب پہنچا تب تک اس نے گردن پھیر کر پیچھے دیکھا بھی نہیں تھا۔ سنسان گلیاں' سوئے ہوئے لوگ' رات کا گھور اندھیرا' وہ خود اکیلا تھا۔ اس نے قبرستان کے نالے پر خون آلود کدال کو دھویا اور پھر وہ نیم کے درخت کے نیچے آنکھیں بند کرکے بیٹھ گیا۔ اس کے اندر طوفان برپا تھا لیکن وہ آنکھیں بند کیے سوچ رہا تھا کہ صبح کو لوگ بچے کا جنازہ لے آئیں گے۔ اس کی قبر کھودنے کے تیس روپے ملیں گے اور پورا ایک ہفتہ کتنا شاندار گزرے گا۔ اس کے بچے کتنے خوش ہوں گے۔ وہ بھی کتنے مان سے گردن اونچی کیے گھر آئے گا۔ اس کی بیوی بھی بادشاہ پیر کی منت کی مٹھائی بانٹے گی۔ وہ اپنا جرم کسی کو بھی نہیں بتائے گا اپنی بیوی کو بھی نہیں جس سے وہ کوئی بات نہیں چھپاتا۔ کسی کو بھی پتہ نہیں چلے گا مگر اس کی سوچوں پر خوف کی بھاری

سل تھی۔ اگر وہ پکڑا گیا تو اسے عمر قید تو ضرور ہو جائے گی پھر اس کے بیوی بچے بھوکوں مر جائیں گے اور وہ ان کے لئے جیل میں روتا رہے گا۔

رات گزر گئی صبح ہوئی نیا سورج اسکے لئے امیدوں کے چراغ جھولی میں چھپائے ابھرا۔ اس کی آنکھیں گیٹ کے اس پار سڑک پر بچھی ہوئی تھیں جہاں سے وہ جنازہ آتا تھا۔ دوپہر کو لوگ کندھوں پر جنازہ اٹھائے گیٹ کے اندر داخل ہوئے۔ یچ مچ کسی بچے کا جنازہ تھا مگر کسی کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ کسی کے چہرے پر دکھوں کا ہجوم نہیں تھا۔ دکھ جو کسی پیارے کے بچھڑنے پر چہرے پہ سایہ کر لیتا ہے۔ وہ بھی کسی کے چہرے پر نہیں تھا۔ وہ سب اس طرح آئے تھے جیسے کوئی فرض پورا کرنے آئے ہوں۔ ایسا فرض جس میں ان کی کوئی بھی دلچسپی نہ ہو۔ وہ بھی کدال اٹھا کر قبر کھودنے لگا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کہیں اس کے دل میں چھپے خوف کو کوئی پہچان نہ لے کہیں بچے کا جنازہ اٹھ کر بیٹھ نہ جائے اور کہہ دے دیکھو یہی ہے میرا قاتل مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ قبر کھودتا رہا تب تک سب لوگوں نے نماز جنازہ پڑھی اور قبر کا انتظار کرنے لگے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ آپس میں کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ اس نے کان کھڑے کئے مگر آواز جیسے دور سے سنائی دے رہی تھی۔ شاید وہ کہہ رہے تھے کہ نجانے کن بدقسمت لوگوں کا بچہ ہے۔ کس کو اس بچے سے دشمنی ہو سکتی تھی۔ کون ظالم تھا۔ جس کو ایک لمحے کے لئے بھی اس پر رحم نہیں آیا تھا۔ کتنی مشکل سے پولیس سے چھپایا ہے۔ نہیں تو بے چارے بچے کی موت اور زیادہ مشکلات پیدا کرتی۔ ماں باپ بے چارے کو ڈھونڈتے ہوں گے پتہ نہیں کون ہے؟ کس جگہ کا ہے۔ اتنی پوچھ گچھ کے باوجود بے چارے کے ماں باپ نہیں ملے مگر وہ ان سب باتوں سے انجان بنا قبر کھودتا رہا۔ قبر کھود کر تیار کی تو لوگوں نے سفید کفن میں لپٹے جنازے کو اٹھایا تب اس نے دیکھا کہ کفن پر خون کے داغ لگے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں کیوں اس کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ جب وہ بچے کو قبر میں اتارنے لگے تو اس کا دل چاہا کہ بچے کا چہرہ دیکھے تو لوگوں کے کاندھوں سے جھانک کر بچے کو دیکھنے لگا اور پھر وہ جیسے اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس کے خون کی ہر بوند میں اندھیرے ہی اندھیرے سماتے گئے۔ موت کے زہر جیسا کڑوا کسیلا ذائقہ اس کے حلق میں پھیلنے لگا۔

ارے........ وہ تو اس کا اپنا بیٹا تھا۔ اس کا لاڈلا بیٹا "منو" اس کا بڑا بیٹا جس کو اس نے اولیاؤں سے منتیں مان کر لیا تھا جو گزرے دو دنوں سے رو رہا تھا۔

ارے...... یہ کیا ہو گیا؟

اس کا لاڈلا بیٹا۔

اس کا منو۔

اس نے اپنے ہاتھوں سے مار دیا۔

وہ چوراہے پر اپنے ہی ہاتھوں لٹ گیا تھا۔

یہ تنہا بھی کیسا تھا کہ وہ ماتم بھی نہیں کر سکتا تھا۔

چپ

مبادا کچھ بول دے۔

تڑپتا رہا۔

"با......" باہر بھاپ نہ نکلے۔

اس کے دل کا شہر

کربلا کا میدان

کائنات کی بے انت سانت

سارے احساسات اپنی موت آپ مر گئے۔

وہ گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ لٹ جانے کا احساس دل میں چھپائے اپنے گناہوں کی صلیب کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تب کسی نے اس کے ہاتھ پر تیس روپے رکھ دیئے۔ دس..... دس کے تین نوٹ۔ نئے کورے نوٹ۔ وہ سب چلے گئے اور وہ اکیلا بیٹھا رہا۔ کسی ایسی قبر کی طرح جس کا کوئی نام نہ کوئی کتبہ ہو۔ آنسو قبر پر گرتے رہے۔ سسکیاں جو اس کے گلے میں گھٹ گئی تھیں۔ اس کے اندر گھٹی ہوئی سسکیاں اندر کے سنسان ایوانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ جب اس کو ہوش آیا تو وہ قبر سے لپٹا کسی لاش کی طرح پڑا تھا۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ سورج آکاش پر آگ برسا رہا تھا مگر اس کے اندر اندھیرے تھے۔ سب کچھ ویسا تھا مگر اس کے اندر کی دنیا مٹ گئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بھی اس قبر کے اندر چلا جائے اور اپنے لاڈلے بیٹے کو گلے لگا کر سو جائے "منو" کے پاس صدیوں' سالوں تک آنکھیں بند کر کے پڑا رہے۔ کاش وہ خود کو بیچ کر بھی زندگی کے وہ تار جوڑ سکے جو اس کے ہاتھوں ٹوٹ گئے تھے۔ کل رات تک موت اس کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ اس وقت وہ زندگی کے لئے کسی پیاسے مسافر کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس وقت اس کی حالت کسی ایسے مسافر کی سی تھی جو صدیوں کے مسلسل تھکا دینے والے سفر کے بعد منزل پر پہنچا ہو اور وہاں پتا چلے کہ وہ اس کی منزل نہیں ہے۔ منزل تو بہت پیچھے رہ گئی ہے۔

اس وقت وہ "سسی" تھا جو بیابان میں بھٹک گیا تھا اس وقت وہ "سوہنی" تھا جس کا بچ دریا میں گھڑا ٹوٹ گیا تھا' اس وقت وہ "مومل" تھا جس نے خود ہی اپنا کاک محل توڑ دیا تھا۔ وہ کئی لمحے سوکھی سوکھی آنکھوں سے قبر کو گھورتا رہا تھا پھر جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ پوری قوت سے کدال ایک طرف پھینکی جو جھاڑیوں میں جا گری اور وہ لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل آیا۔ گھر جاتے ہوئے جانے کتنی دفعہ تیز ٹریفک کی زد میں آتے آتے بچا۔ وہ کسی دکھ کی طرح لڑکھڑاتا رہا تھا۔ مٹھی میں دس دس کے تین کورے نوٹ تھے مگر دوسرا ہاتھ کدال سے خالی تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنا وجود بے حد بھاری محسوس کر رہا تھا۔ جب وہ اپنے گھر کی گلی میں داخل ہوا تو اس کی بیوی گھر کی دہلیز پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھل مل کر رہے تھے۔ اس کو آتا دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی مگر وہ لڑکھڑاتا ہوا اندر چلا گیا اور وہ اس کے پیچھے دوڑتی ہوئی آئی اور اس کے پاس آکر سسک پڑی۔

"منو رات سے تمہارے پیچھے نکلا ہے۔ میں تو بہت منع کیا تھا مگر وہ مانا ہی نہیں۔ کہنے لگا دیکھوں ذرا بابا کو پیسے ملے یا نہیں........ وہ تمہارے پاس پہنچا تھا کہ نہیں۔"

وہ چپ تھا موت کی طرح۔

"تم.... تم..... بولتے کیوں نہیں' بولتے کیوں نہیں؟"

(خاموشی)

وہ اب بھی چپ تھا۔

بالکل نہیں بولا' بالکل نہیں تڑپا۔

"......... تم رو کیوں رہے ہو۔ کیوں رو رہے ہو؟"

"منو کہاں ہے....... تم اکیلے کیوں ہو' میرا بیٹا کہاں ہے؟" وہ اندر ہی اندر لرزتا رہا....... جلتا رہا۔

"تم بولتے کیوں نہیں ہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ کچھ ہوا ہے۔"

"تم بتاتے کیوں نہیں؟" اس کی بیوی پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کی قمیص کے کالر پر تھے۔ دونوں بچے حیران و پریشان ماں باپ کو دیکھ رہے تھے۔ وہ کسی ایسے مجرم کی طرح گردن جھکائے کھڑا تھا جس میں جرم قبول کرنے کا حوصلہ نہ ہو مگر کورٹ میں اس کا جرم ثابت ہو گیا ہو۔

"میرا منو کہاں ہے؟" اس کی بیوی کی چیخیں زمین سے آسمان تک جا رہی تھیں۔

تب کوئی جواب دینے کی بجائے اس نے اپنی مٹھی سے تیس روپے نکال کر بیوی کے پھیلے ہاتھ پر رکھ دیئے اور اپنے چھوٹے بیٹے کو سینے سے لگا کر بچوں کی طرح سسک سسک کر رونے لگا۔

وہ چپ تھا موت کی طرح۔

"تم..... تم..... بولتے کیوں نہیں' بولتے کیوں نہیں؟"

(خاموشی)

وہ اب بھی چپ تھا۔

بالکل نہیں بولا' بالکل نہیں تڑپا۔

"....... تم رو کیوں رہے ہو۔ کیوں رو رہے ہو؟"

"منو کہاں ہے...... تم اکیلے کیوں ہو' میرا بیٹا کہاں ہے؟" وہ اندر ہی اندر لرزتا رہا...... جلتا رہا۔

"تم بولتے کیوں نہیں ہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ کچھ ہوا ہے۔"

"تم بتاتے کیوں نہیں؟" اس کی بیوی پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کی قمیص کے کالر پر تھے۔ دونوں بچے حیران و پریشان ماں باپ کو دیکھ رہے تھے۔ وہ کسی ایسے مجرم کی طرح گردن جھکائے کھڑا تھا جس میں جرم قبول کرنے کا حوصلہ نہ ہو مگر کورٹ میں اس کا جرم ثابت ہو گیا ہو۔

"میرا منو کہاں ہے؟" اس کی بیوی کی چیخیں زمین سے آسمان تک جا رہی تھیں۔

تب کوئی جواب دینے کی بجائے اس نے اپنی مٹھی سے تیس روپے نکال کر بیوی کے چپلے ہاتھ پر رکھ دیئے اور اپنے چھوٹے بیٹے کو سینے سے لگا کر بچوں کی طرح سسک سسک کر رونے لگا۔

ولی رام ولبھ

لکیریں.........جو پھلانگیں نہ جاسکیں

صبح سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ لگ رہا تھا جیسے پانی کی موٹی چادر گر رہی ہو۔ وہ اپنے گھر میں ہی بیٹھی رہی' کہیں آئی نہ گئی۔ کہیں جا بھی نہیں سکتی تھی۔ کم بخت بارش ہوتی ہے تو دل میں آگ لگا دیتی ہے۔ سڑکوں پر گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ پانی جمع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس کے دل میں بھی جگہ جگہ گڑھے تھے' جس میں یادوں کا پانی جمع تھا اور کتنی ہی باتیں اور کتنے ہی قصے اس پر تیر رہے تھے۔ زخم کھل گئے تھے' درد ابھر آیا تھا۔ وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی' تاکہ وقت کے دھارے میں نہ بہہ نکلے۔ ہاتھ کام کرنے میں مصروف تھے' مگر ذہن سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ وہ سوال پوچھ رہی تھی۔

وہ ماضی کے بھنور میں ڈوب کر مرگئی تھی۔

شوہر افسر تھا۔

گاڑی لیکر چلا گیا۔

اسکول جانے والے بچے تھے۔

بس آئی۔ چلے گئے۔

اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ اب وہ اکیلی تھی' اپنے بنگلے کے قلعے میں بند رہ کر بھی آزاد تھی' مگر بارش نے قلعے کے چاروں طرف چار دیواری کھڑی کر دی تھی اور بنگلہ بگلے کی طرح مراقبے میں کھڑا جھیگ رہا تھا۔ اس کے اوپر کہیں بھی پانی نہیں ٹپک رہا تھا' کہیں سے گیلا نہیں ہوا تھا۔ نیلا رنگ بھی کہیں سے نہیں اترا تھا۔ بھیگے ہوئے کپڑے کی طرح باغ میں پتے' پھول' ٹہنیاں جھول رہے تھے اور سب کے سب دھل کر صاف ہو گئے تھے۔ کسی پر نہ تو مٹی تھی' نہ میل' نہ کیچڑ کا نشان مگر۔۔۔۔

اسی بارش نے اس کے اوپر لپٹی ہوئی چادر کھینچ لی تھی۔ جسم پر پڑی عزت کی چادر بھگو دی تھی۔ نپی تلی خوشیوں نے شک دور کرنے کا اظہار ختم کر دیا تھا۔

وہ کپڑے پہن کر لپٹی لپٹائی جانے لگی۔ سوئٹر' اسکارف' دستانے' موزے' سینڈل' اوورکوٹ مگر پھر بھی وہ بالکل بے لباس تھی۔ کانپ رہی تھی' پھر اس کے اور اس کے دل میں موجود دوسرے وجود میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ اس کے دو دل بجلی سے ٹکرا گئے۔

کوئی مہمان بھی نہیں ہے۔

کسی کا بلاوا نہیں ہے۔
کسی کا پیغام نہیں ہے۔
کسی کا فون بھی نہیں ہے۔
آج کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے۔
ماضی سے نکل کر حال میں ہچکنے والے حادثے۔
ا یکسیڈنٹ
تار
بیماری
سائے ڈھل گئے۔ ابھی وہ آئے گا۔ بچے آئیں گے۔ وہ پھر زندہ ہو جائے گی' مگر جب شام آتی ہے' تو جاتی بھی ہے۔ عورت کی طرح تو نہیں ہے کہ ساری زندگی مرضی یا بنا مرضی سے روتی اور گھلتی وہیں خاموش ہو جائے۔
شام رات کے لیے جگہ بنا کے چلی جاتی ہے۔ عمر قید نہیں ہے۔ ایک ہی رشتہ زبردستی۔ لوٹ مار۔ کوئی فرق نہیں ہے' کوئی تبدیلی نہیں ہے۔
چھوتا
بو
بول
سب کچھ وہی بدبودار سڑے ہوئے۔
دیکھے بھالے' جانے پہچانے' مرے مرے۔
"اماں کہانی سناؤ نا۔"
"راجہ بیٹے! کونسی کہانی سنو گے؟"
"کوئی اچھی سی کہانی سناؤ نا۔"
"راجہ!" ہاں وہ اسے ہمیشہ راجہ کہہ کر پکارتی تھی۔ وہ کہتا تھا۔ "کتنی پیاری ہو---- پیاری۔"
"اماں۔"
"ہوں؟"
"کہانی سناؤ نا۔"
"اچھا سنو۔"
"بیٹا ایک دن بہت بارش ہوئی موسلا دھار زور دار-----"
"آج کی بارش کی طرح؟"
"ہاں بیٹے۔"

"پھر کیا ہوا اماں؟"

وہ سوچتی رہی کہ آگے کیا ہوا! بارش آئی تو وہ بہت زیادہ یاد آیا' پھر.....؟

"اماں۔"

"ہاں بیٹے سنو------ بہت بارش ہوئی چڑیا کا گھر تنکوں سے بنا ہوا تھا۔ کوئے کا گھر کچا تھا۔ چڑیا کا گھر بارش میں بھی جوں کا توں کھڑا رہا نہ کہیں کچھڑ نہ مٹی----"

"-----مگر اماں کوئے کا گھر مٹی کا بنا ہوا تھا۔ جو ڈھے گیا------"

"ہاں؟ نہیں بیٹا اگر اسکا گھر ڈھے جائے تو پھر وہ کہاں جائے گا۔"

"غریب؟ اس کا دوسرا ہے بھی کون؟"

"اماں ابھی تک وہ بارش میں بھیگ رہا ہے؟"

"نہیں راجہ بیٹے' وہ چڑیا کے گھر آتا ہے اور اسے کہتا ہے------"

"اماں وہ کہتا ہے۔ چڑیا بہن دروازہ کھولو۔"

"ہاں بیٹے۔"

"چڑیا نے دروازہ کھولا؟"

"نہیں"

"کیوں؟"

"ایسے ہی بیٹے' ایسے ہی۔"

"اسے دروازہ کھولنا چاہیے۔ ہماری مس ہمیشہ کہتی ہیں کہ پڑوسی سے پیار کرنا چاہیے۔"

"پڑوسی سے پیار کرنا چاہیے۔ تمہاری مس نے یہ کہا ہے؟"

"ہاں - کیوں؟"

"نہیں' پڑوسی سے پیار نہیں ہو سکتا ہے' بیٹے۔"

"کیوں؟ وہ خراب ہوتا ہے؟"

"نہیں بہت اچھا' پیار-----"

"ہاں کہو نہ اماں۔"

وہ چپ رہی۔ بچے کو پیار سے سہلاتی رہی۔ بچہ اوں---- اوں کرتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ماں کے پیٹ پر پاؤں رکھ کر سو گیا۔ وہ سوچتی رہی۔ اسٹیڈی سے روشنی آرہی تھی۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ آج ساری رات وہ کام کرتا رہے تو ٹھیک ہے۔ آج وہ اکیلی سونا چاہتی تھی۔ آج اسے کوئی نہ چھیڑے۔ نہیں تو اس کا جسم بول اٹھے گا۔ اس کی روح کی زبان میں جسم باتیں کرے گا۔

مگر خاموشی کی زبان ہر ایک کی سمجھ میں آتی ہے؟

مگر وہ سمجھ جاتا تھا۔

ذہین تھا' پہچان جاتا تھا۔

مگر یہ؟ اس کو یہ بولی سمجھ میں نہیں آتی۔

تو کیا ہوا؟ اسے تو سب حق حاصل ہیں۔ خاموشی کی زبان نہ بھی سمجھے تو کیا ہوا؟

اسے لگا جیسے وہ طوائف ہے' لاچار ہے' دوسرے کی محتاج ہے' بندھنوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اس کے دل میں آیا کہ سارے بندھن توڑ دے۔ اس نے بچے کا پاؤں اپنے اوپر سے ہٹا دیا۔ بچے نے کروٹ لے کر اپنی دودھ جیسی بانہیں ماں کے گلے میں ڈال دیں۔ وہ ممتا سے مغلوب ہو کر پیار سے بچے کے ریشم جیسے بالوں پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ یہ ریشم کا جال کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ کبھی بھی نہیں۔

اس لئے شاید چڑیا نے کوئے سے کہا ہو گا۔

"ٹھہرو میں اسوقت بچے کو دودھ پلا رہی ہوں۔۔۔۔ میرا بچا بڑا ہو گا۔ اس کی شادی ہو گی۔ اس کی دلہن آئے گی' پھر کوئے کو اپنے گھر آنے کی اجازت دے گی۔"

آج بچے کا جال گلے میں ہے۔۔۔۔

کل پوتے کا جال ہو گا۔

ایسے ہی' اسی طرح موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بادل گھر کر آئے تھے۔ وہ آیا تھا' تو اس نے اپنے خوشبودار آنچل سے اس کے بال اس طرح صاف کیے تھے' جیسے کسی بچے کے بال صاف کیے ہوں اور پھر اس نے اسے سینے سے لگا کر ہلکی سی سرگوشی کی تھی۔

"ہائے اب آنکھوں میں سرمہ بھی لگا دو۔۔۔۔ بچہ ہوں نا۔"

"کون ہے؟"

اماں نے پوچھا تھا۔

"کوئی نہیں ہے اماں میری سہیلی ہے۔"

"۔۔۔ اچھا اچھا۔"

اندھی ماں' جپ مالا لیے چپ چاپ بیٹھی رہی۔

اسی بارش میں دونوں نے چائے پی' ناشتہ کیا اور بہت راز و نیاز سے پیار بھری باتیں کیں اور پھر وہ چلا گیا۔

اس نے اپنی اماں کو دھوکا دیا تھا؟

ماں کو یا اپنے آپ کو؟ یا دنیا کو؟

شاید سب کو ہی' مگر اسے نہیں۔

سچ؟

وہ اس کے گھر نہیں جا سکتی تھی۔

اس کی بیوی اسکا رستہ روکے کھڑی تھی۔

"راجہ اب مجھے شادی کرنی ہی پڑے گی۔ اماں اب بالکل نہیں مانتی۔"
"مگر ہم نے جنم جنم ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا۔"
"ہاں! میرے راجہ مگر تم تو پہلے ہی بندھن میں بندھے ہوئے ہو۔"
"رانی وہ تو ظاہری بندھن ہے۔ میں تو اکیلا ہی ہوں۔"
"مگر حق تو اسی کا ہے۔"
"یہ باتیں کب تک دھراتی رہو گی؟"
پھر اس نے بہت اصرار کیا' مگر اماں نہیں مانتی' تو وہ کہنے لگی "جا رہی ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔ اپنا گرتا گھر بچانا۔"
"کبھی تمہارے دروازے پر آؤں۔ تو اندر آنے دو گی۔"
"ضرور کسی وقت بھی آسکتے ہو۔"
"نہیں تم ایسا نہیں کر سکو گی۔"
"کیوں نہیں؟ کیوں نہیں کر سکوں گی۔ جوانی تو کسی طرح گزر جائے گی' مگر بڑھاپے میں ایک دوسرے کی ضرورت پڑے گی۔ زندہ ایک ساتھ نہیں رہ سکتے ایک ساتھ مر تو سکتے ہیں۔"
"نہیں میں اتنا جینا نہیں چاہتا جھکا جھکا' تھکا تھکا' کھانستا ہوا تمہارے دروازے پر آکر کیا لوں گا؟ کیا دوں گا؟"
"راجہ پلیز اتنی اداس باتیں نہ کرو۔۔۔۔۔۔۔ تمہیں میری قسم۔"
اس کے بعد وہ کبھی نہیں آیا' نہ ہی کہیں ملا۔ یہ مہینے کتنی مشکل سے گزرے۔ سکھ کے لمحے بھی کھینچ تان کر گزر گئے۔ اب تو یاد بھی پرانی ہو گئی تھی۔ اس دن اگر آجاتا تو وہ بچ بچ سب کچھ چھوڑ کر اس کے ساتھ چلی جاتی۔
اب آیا تو؟
یہ بچہ۔۔۔۔۔ اب آیا تو نہیں جائے گی۔
شوہر؟
عزت؟
سماج؟
وہ سوچتی رہی۔ اب وہ اکیلی نہیں ہے۔ بچہ ہے' سماج میں لوگ عزت سے جانتے ہیں۔ شوہر بھی خراب نہیں ہے۔
یہ گھر۔۔۔۔ یہ سب فرنیچر' زیور' کپڑے' کراکری' برتن۔۔۔۔۔ نہ' اب وہ کیسے جاسکتی ہے۔ کتنے بندھن ہیں' کتنے جال ہیں۔ سوچتی رہی۔ پتہ نہیں جانے کب آنکھ لگ گئی۔
اسٹیڈی میں جلتی بتی بجھ گئی۔ دو پاؤں نزدیک آئے۔ ماں اور بیٹے کو کمبل اوڑھا کر اپنے کمرے میں

واپس گئے۔

وہ جاگ پڑی۔ آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

ہوا لگ رہی تھی' تیز ہوا۔ بارش ہو رہی تھی۔

اوہ۔۔۔۔ دروازے پر کون ہے؟ کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے؟

وہ؟ آیا ہے؟ اتنی بارش میں؟

سہارا' آسرا مانگنے آیا تھا؟

وہ اتنے برس راہ دیکھتا رہا؟

پیار کرتا رہا؟ سوگند؟ ملاپ۔

اور وہ خود؟ عزت' پیسے' بچوں کے جال میں پھنسی ہوئی تھی؟

دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔

وہ ایک دم چھلانگ مار کھڑی ہو گئی۔ کمبل جا کر دور گرا' بچے پر سے بھی اتر گیا۔

وہ کانپتے پیروں سے دروازے پر آئی۔

وہ بارش میں بھیگ رہا تھا۔ وہ کھڑا ہے۔ اب وہ اسے اندر لے آئے گی۔

مایا۔۔۔۔ ماتا۔۔۔۔

اس کا اکیلا پن ختم کر دے گی۔

اس نے دروازے کے کواڑ پر ہاتھ رکھا اور اچانک وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

اس کے دروازے پر میڈم بوواری کی لاش ٹنگی ہوئی تھی۔

فلابئر کی نائیکہ...... میڈیم بوواری۔

پر یتم نے دھوکا دیا۔

اس نے زہر پی لیا۔ میڈم تڑپ رہی تھی۔ اس کا جسم اذیت سے اکڑ گیا تھا۔

ہونٹوں کے کونوں پر خون جما ہوا تھا۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔

میڈم کا بہت پیار کرتا شوہر۔

گھبرایا ہوا چھوٹا لڑکا۔

موت کے دروازے پر کھڑی میڈم بوواری۔

وہ دوڑتی دوڑتی اپنے شوہر کے کمرے میں آئی اور شوہر کے گلے میں بانہیں ڈال دیں' اس کے ساتھ لپٹ گئی' کتنا گھبرا گئی تھی۔ ڈرپوک میڈم چڑیا۔

چڑیا کا دروازہ بند ہے۔

بارش بند ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔

وہ باہر کھڑا ہے۔

اکیلا

بے چارہ کوا۔

اکادمی ادبیات پاکستان کے اشاعتی منصوبے کے تحت پاکستانی زبانوں اور ان کے ادب کی ترویج و فروغ کے ضمن میں مختلف سلسلے اشاعت و طباعت اور ترتیب و تدوین کے مرحلوں سے گزر رہے ہیں۔ قومی زبان میں دیگر پاکستانی زبانوں کی ادبی تخلیقات کو منتقل کرنے کا کام اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

زیر نظر مجموعہ سندھ کے ان ممتاز تخلیق کاروں کے افسانوں پر مشتمل ہے جنہوں نے نہ صرف یہ کہ فنی اعتبار سے افسانے کو نئی سمتیں عطا کی ہیں بلکہ فکری طور پر بھی تازہ ترجہات کا اضافہ کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج سندھی افسانے کو پاکستان کے فکشن ادب میں بہت اہم مقام حاصل ہے۔